

عظمت آدم

سرورق اور زیبائش ✡ حنیف رامے

ظہیر کاشمیری

عظمت آدم

نیا ادارہ

بار اول - ۱۹۵۵ء

تعداد اشاعت : ۱۱۰۰

طابع و ناشر: نذیر احمد چودھری
سویرا آرٹ پریس ، لاھور

کمپوزیٹرز
ایم - قمر خان * ایم - منور اقبال

ترتیب

بامن آویزشِ اُو الفتِ موج است و کنار
دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزاں از من

از گدازِ شمع باشد، شعلہ را پائندگی
می کند از پہلوئے مظلوم، ظالم زندگی

مجنوں کمندِ طرۂ لیلیٰ کند خیال
برروئے دشت جلوۂ موجِ سراب را

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانیٔ صحرا نوشتہ ایم

عصرِ حاضر کے نام —

میری زندگی، میرا فن

میٹرک '۳۶ء' سے میری شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس وقت تک میری زندگی کم و بیش ان تمام تلخیوں سے دو چار ہوچکی تھی۔ جن سے ایک نچلے درمیانہ طبقے کا فرد گریز کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔ جہالت، مفلسی اور تشدد میرے ماضی کا آثا ثہ تھے۔ جنہوں نے ذہن پر عکس انداز ہو کر موت، ہراس اور بد اعتمادی کی صورت اختیار کرلی تھی...... میرا سینہ اور شعور ایک غیر بیانی گھٹن محسوس کرتے تھے... اور فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں، ان حالات میں میں نے جب شعر کہنا شروع کئے، تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مجھے فرار کا راستہ مل گیا۔ میں نے خارجی ٹھوکوں سے بچنے کے لئے غنائی شاعری میں پناہ ڈھونڈلی، اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بچنے کے لئے اپنے گرد 'بے کار' رومان کے دائرے بننا شروع کردئے۔

''اس وقت میرے خیالوں میں زندگی کی کوئی گہرائی یا پیچیدگی نہ تھی۔ میں ابھی زندگی اور کائنات کے عقلی تجربوں سے کوسوں دور تھا۔ میرے کچے جذبوں میں تفکر کی کمی تھی۔ اس لئے کہ تفکر سن رسیدگی اور مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے۔ میں ہلکی ہلکی بحروں میں روائیتی عشقیہ مضامین باندھتا اور انہیں مقامی مشاعروں میں جا کر تحط اللفظ سنا آتا۔

میرا ابتدائی فن اُس طالب علم شاعر کا ذہنی عکس ہے۔ جو عام درمیانہ طبقہ میں پیدا ہوا، جس نے گھریلو تشدد کا تجربہ کیا، جسے گستاخی اور بغاوت سے بچنے کے لئے روایت اور منقولیت کے منتر یاد کرائے گئے، اور جو ماضی اور گرد و پیش کی المیہ کیفیت سے متاثر ہو کر غم جاناں میں لذت مرگ کو تلاش کرنے لگا۔''

بارھویں جماعت میری زندگی کا تاریخی سال ہے ـــــ میں ایک دن

مر کیڈو ہال میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا، ایک سکھ نوجوان ہال میں داخل ہوکر میرے قریب آیا، اور بڑے ہی دوستانہ لہجہ میں مجھ سے مخاطب ہوا، کامریڈ!

میں اس انداز تخاطب سے چونک پڑا، میں نے کامریڈ کا لفظ کتابوں میں تو پڑھا تھا اور یہ بھی سن رکھا تھا کہ یہ لفظ کسی بہت بڑے 'خطرے' کا پیش خیمہ ہوتا ہے، لیکن اس وقت تک کسی ٹھیٹھ قسم کے کامریڈ سے یوں ملاقات نہ ہوئی تھی۔ میں نے سکھ نوجوان کے اس فقرے کو بمشکل ھضم کرتے ہوئے کہا:

''آئیے سردار صاحب کیسے آنا ہوا''

اس نے نہایت راز دارانہ لہجہ میں سرگوشی کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ خالصہ کالج کا طالب علم ہے۔ اور دوسرے کالجوں کے طلباء کے ساتھ مجھے ملنے آیا ہے۔ اس نے مجھے پرل ٹاکیز کے ہال میں چلنے کو کہا، کیوں کہ اس کے باقی ساتھی وہیں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں اس کے ہمراہ پرل ٹاکیز پہنچا، وہاں مختلف کالجوں کے دس کے قریب طلباء موجود تھے، جن میں ایک دو میرے شناسا بھی تھے، جب ان سے میری باتیں ہوئیں، تو مجھے وہ بہت ہی 'باغی' معلوم ہوئے۔ وہ سب کے سب سٹوڈینٹس فیڈریشن کے ممبر تھے، وہ سٹوڈینٹس فیڈریشن جس کے ممبروں پر انہی دنوں یو-پی کی کانگرسی حکومت نے رائفلوں کے منہ کھول دئے تھے۔ انہوں نے مجھے ترغیب دی کہ میں بھی اپنے کالج میں فیڈریشن کی اکائی تربیت دوں۔ میں چوں کہ ان 'خوفناک طلباء' کے کرخت لہجوں کی تاب نہ لاسکتا تھا اس لئے میں نے جھوٹے سچے منہ سے ہاں کہدی۔

اس کے بعد میری ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں ہر مذہب کے طالب علم موجود تھے، ہندو، طلباء بحث کرتے وقت ویدوں کو بطور حوالہ کبھی پیش نہ کرتے، مسلمان طلباء بحث کرتے وقت آئیتوں سے ثبوت نہ ڈھونڈتے اور عیسائی طلباء مباحثہ میں انجیل کا کبھی ذکر نہ کرتے، ان کی بحثیں منطقی اور وزنی ہوتیں۔ وہ مختلف مذہبوں سے متعلق ہوتے ہوئے بھی ایک معلوم

ہوتے۔ انہوں نے مجھے بتایا، کہ وہ غلط روایت پرستی کے ہی خلاف نہیں بلکہ تشدد اور غربت کے خلاف بھی جہاد کرتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر مجھے محسوس ہوا جیسے ان سے مل کر میں آباء کی روایت پرستی، والدین کے تشدد اور گھریلو مفلسی سے واقعی چھٹکارا پاجاؤں گا۔ اور پھر ان میں رہ کر مجھے آہستہ آہستہ معلوم ہوا، کہ سٹوڈینٹس فیڈریشن کی جد و جہد کوئی معمولی جد و جہد نہیں، اس جد و جہد سے صرف میرے گھر میں ہی انقلاب نہیں آئے گا بلکہ ملک بھر کے گھروں کی کایا پلٹ جائے گی۔

انہی دنوں ہندوستان کے گوشے گوشے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی اکائیاں بننا شروع ہوگئیں۔ سٹوڈینٹس فیڈریشن کے ممبروں نے مجھے بتایا کہ اس نوزائدہ انجمن کو چلانے والے بھی اپنے ہی لوگ تھے۔ چنانچہ میں جو مکمل طور پر 'او ڈی پس' بن چکا تھا، سچائی کے کھوج میں ہر خطرے سے بے نیاز ہوکر اس کا بھی ممبر بن گیا۔

سٹوڈینٹس فیڈریشن کے مقامی دائرۂ مطالعہ سے میں مستقلاً عمرانی آئیلی اور سماجی مسائل کے متعلق تعلیم حاصل کرتا رہا، کانگرس کی تاریخ کو سمجھا، برطانوی سامراج کی نیچر سے واقفیت حاصل کی۔ اشتمالیوں کی عالمگیر جدوجہد پر لکچر سنے، ٹریڈ یونینوں اور کسان سبھاؤں کے انقلابی کارناموں سے واقف ہوا، اس خیال انگیز تعلیم نے مجھ میں خود اعتمادی پیدا کردی، اور نا موافق حالات کو بدل دینے کا عزم بیدار کر دیا۔ یوں میں نے پہلی بار زندگی کو زندہ حقیقت جاننا شروع کردیا۔

"ترقی پسند ادیبوں میں رہتے ہوئے جب میں نے ان کے ادب پاروں کا جائزہ لیا۔ تو ان کا ماحصل بھی وہی تھا جو سٹوڈینٹس فیڈریشن کے دائرۂ مطالعہ کی اکثر بحثوں کا ہوا کرتا تھا۔ یہاں رہ کر مجھے اپنی گذشتہ ادبی کاوشوں پر افسوس ہونے لگا۔ میں اکثر سوچنے لگا کہ میری گذشتہ شاعری جہالت کی پیدا وار ہے۔ وہ زندگی اور حقیقت زندگی سے بہت دور ہے۔ اس کا انسانوں کے زندہ مسائل سے کوئی بھی تعلق نہیں ... چنانچہ میں نے آہستہ آہستہ نئے مطالعوں اور نظریوں کو ادبی سانچوں میں ڈھالنا شروع کردیا۔

ایسا کرنے میں مجھے بہت دقتیں پیش آئیں۔ میرے لئے فارسی کلاسیکی شعراء، اور اردو کے غزل گو شعراء کی روائتوں سے ہٹ کر نئے مواد کے لئے اسلوب کی نئی قدریں تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ نئے نظریوں اور پرانے ادبی معیاروں میں تطابق پیدا کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اگر نصب العین پر توجہ رہتی، تو معیار ھاتھ سے نکل جاتا۔ اور اگر معیار قائم رکھا جاتا تو خیالات سائنٹیفک نہ رہتے۔ اس طرح کوئی تخلیق تو نا پختہ وطن پرستی کی حامل بن جاتی اور کبھی اسلوب کی روایت پرستی اس طرح غالب آجاتی کہ نئے خیالات بھی بظاہر پرانے دکھائی دیتے۔"

اس وقت میں ترقی پسندی کا عام مفہوم تو سمجھتا تھا لیکن اس کی تمام منطقی پیچیدگیوں سے ناواقف تھا۔ اس زمانے میں جب ملک راج آنند انجمن کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہوئے ہماری ایک محفل میں آئے تو میں نے لفظ ترقی پسندی پر ان سے کافی دیر بحث کی۔ اس بحث سے میرے ذہن میں ترقی پسندی کا مفہوم پہلے سے...... کہیں زیادہ واضح ہوگیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ ترقی پسندی کا تصور مقامی اور وقتی نہیں بلکہ ہمہ گیر اور عمومی ہے۔ اس کا تعلق اولاً انسانی ارتقاء سے ہے۔ اس کا تعلق دنیا کی ہر نومولود صالح طاقت سے رہا ہے اور ہے۔ جو ادب صالح اور افادی قوتوں کی عکاسی کرکے انہیں شہرت دوام بخشتا ہے، بہتر مستقبل کی بشارت دیتا ہے' اور اسے قریب ترلانے کا دعویدار ہے، ترقی پسند ادب ہے۔

"یہ تو میں سمجھ چکا تھا۔ کہ ترقی پسند ادب کا اولاً انسانی ارتقا سے تعلق ہے۔ لیکن ابھی تک میرے ذہن میں ارتقائی عمل کا کوئی واضح، مکمل اور مستند نقشہ قائم نہ ہوسکا تھا۔ دائرہ مطالعہ نے تجزیاتی طور پرتو بہت کچھ بتایا تھا لیکن اسے کسی طرح synthesize نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے لاتعداد موضوع دے کر میری طبیعت میں اپچ پیدا کی اور میں نے شعر کہنے کے علاوہ مضمون اور افسانے لکھنا شروع کردئے تو ان میں بنیادی اور صحیح تفصیلوں کی اکثر کمی ہوتی تھی۔ افسانوں میں لکچر بازی کے علاوہ وحدت تاثر اور پلاٹ کی اکائی کو نظرانداز

کر دیا گیا ہوتا - اس کے باوجود جوں جوں وقت گذرا انجمن کے ادب آموز جلسوں میں میری ادبی شخصیت ڈھل کر نکھر گئی اور میں دن بدن فکر و اسلوب کے معاملے میں زیادہ محتاط ہوتا گیا -"

میری ادبی ترویج کے اس دور میں ۳۹ء کا تاریخی سال بھی آچکا تھا - چمبرلین محوری طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کرچکا تھا اور ہندوستان برطانوی نو آبادی کی حیثیت سے اس میں پوری طرح شریک ہوچکا تھا - کالج میں یو - ٹی - سی کھل چکی تھی ، تحصیلداروں زمینداروں اور خان بہادروں کے بیٹے کتابیں پھینک گورے آقاؤں کی خاطر Gun Fodder بننے جا رہے تھے - سٹوڈینٹس فیڈریشن کے ممبروں کی گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں - ٹریڈ یونین کانگرس کے ورکروں کو جیلوں میں ٹھونسا جارہا تھا- کسان سبھاؤں پر کڑے پہرے بٹھائے جارہے تھے - منڈیوں اور بازاروں سے لے کر وائیسریگل لاج تک جنگی شور تیز تر ہوتا جا رہا تھا - اور یونہی اس عالمگیر خونی ڈرامہ سے انجمن ترقی پسند مصنفین بھی محفوظ نہ رہ سکی -

میں ایک دن کالج جانے سے پہلے ہندوستان ٹائمز پڑھ رہا تھا -اچانک ایک جگہ پر مجھے فوراً رک جانا پڑا - لکھا تھا "My services are at the disposal of his Excellency" اور نیچے ڈاکٹر ایم - ڈی تاثیر کے دستخط تھے - ڈاکٹر تاثیر ہماری انجمن کے ممتاز ممبروں میں سے تھے - وہ بھی دوسرے ممبروں کی طرح اس جنگ کو سامراجی جنگ سمجھتے تھے - وہ بھی انقلابی سمجھے جاتے تھے ...... لیکن اس خبر نے ان کی انقلاب پسندی کو بالکل ننگا کر دیا - وہ ابن الوقت بن چکے تھے - وہ گورے آقاؤں کا ایجنٹ بن گئے تھے - ہم نے ان سے ایک دو بار اس خبر کی صحت کے بارے میں دریافت کیا - لیکن وہ آئیں بائیں شائیں کرکے رہ گئے - اور چند ھی روز بعد لوگوں نے اس بڑے 'انقلابی' کو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے برلن کی خبریں کے عنوان سے تقریریں کرتے سنا جو ملک فروشی کا بدترین نمونہ کہی جا سکتی تھیں -

اسکے بعد پروفیسر فرید کی باری تھی ، وہ اسلامیہ کالج جالندھر کے پرنسپل بنے اور 'منقار زیر پر' ہو کر رہ گئے - پروفیسر بی - ایل کپور

فاضلکا کالج کے پرنسپل بن کر قوت گویائی کھو بیٹھے' پروفیسر ایڈوانی نے یکایک سیاستدان سے شریف شہری کا روپ دھار لیا۔ فیض احمد فیض جو اُن دنوں انجمن کے سکریٹری تھے ہیلی کالج آف کامرس کی نذر ہو گئے......اور یوں ۱۹۴۱ء تک انجمن ترقی پسند مصنفین کا ناقابل شکست محاذ بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا اور میں ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گرفتار کر لیا گیا۔

شروع میں مجھے امرتسر جیل میں رکھا گیا ۔ وہاں میں نے حکام جیل کے تشدد کے خلاف قیدیوں سے بھوک ہڑتال کروا دی ، جس کی پاداش میں مجھے تین ماہ کے لئے قید تنہائی میں پھینک دیا گیا۔ قید تنہائی ختم ہوئی تو مجھے ایک دو جیلوں میں تبدیل کرنے کے بعد بورسٹل جیل لاہور میں منتقل کر دیا گیا ۔ بورسٹل جیل میرے لئے بہت بڑی سیاسی درسگاہ ثابت ہوئی ۔

اُن دنوں بورسٹل جیل میں قریباً چار سو سیاسی قیدی تھے ، جنگ آزادی کے بوڑھے جرنیل، تازہ دم انقلابی ، کانگرسی، سوشلسٹ ، کمیونسٹ ، انارکسٹ ، ...... یہاں سارے شمالی ہند کی 'خطرناکیاں' جمع تھیں ۔ یہاں مجھے ہر جماعت کی عملی سیاست سمجھنے کا موقع ملا ۔

یہاں میں نے پونا ، ستارا کے دہشت پسندوں کی داستانیں سنیں ۔ میرٹھ سازش کیس کے واقعات سنے ۔ شیکھر چندر آزاد اور اس کے گروپ کے کارناموں سے متعارف ہوا ۔ راولپنڈی کے پرانے بم بازوں سے ملا ، یہاں میں نے مختلف انقلابی تحریکوں کے اُن گمنام بہادروں کے تذکرے سنے جو سماج کی داد و دہش سے بے نیاز ، انقلابی مشن پورا کرتے ہوئے خموشی سے شہید ہوگئے ، اور جن کا ذکر شاید کوئی سیاسی تاریخ نہ کر سکے گی ۔ بورسٹل جیل کے ایک پرانے محافظ نے مجھے وہ کوٹھری دکھائی ، جہاں داس نے مسلسل فاقہ کشی کرکے شہادت خریدی تھی ۔ جیل کا وہ محافظ اگرچہ پیشہ ور جلاد تھا اور وہ ان گنت مجرموں کو اپنے ہاتھ سے شکنجوں میں کس چکا تھا ۔ اس کے باوجود جب وہ داس کی قربانی کے چشم دید واقعات سنا رہا تھا تو اس کی خشخشی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی ۔

بورسٹل جیل میں ہم نے کرتی ، کمیونسٹ اور سوشلسٹ ، کارکنوں

پر مشتمل ، انتہا پسند بلاک ، کی بنیاد رکھی - اپنے وارڈ کے سب سے اونچے درخت پر سرخ جھنڈا نصب کیا - کھلے میدان میں قلعی چونے سے بہت بڑا درانتی ہتھوڑا بنایا - اور ہر صبح 'سارا سنسار ہمارا ہے' کے جذبات آفرین کورس سے جیل بھر کو لرزانہ شروع کر دیا......

' انتہا پسند بلاک ' کی نوعیت زیادہ تر دائرۂ مطالعہ ہی کی تھی - یہاں میں نے دوسرے رفیقوں کی مدد سے مارکسیت کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا - جدلی مادیت ، مارکس کا فلسفۂ تاریخ اور نظریۂ اقتصادیات بغور پڑھا اور اس پر بحثیں کیں - مختلف ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کی لافانی جد و جہد سے واقفیت حاصل کی - پیرس ، جرمنی اور بلغاریہ کے انقلابوں کی ناکامی کو سائنٹفک طور پر سمجھا - چین کی صبر آزما عوامی سرگرمیوں پر لکچر سنے ، دوسری عالمگیر جنگ سے پیدا ہونے والے ناگزیر واقعات کا شعور حاصل کیا - جدید علوم کی اس باقاعدہ تحصیل نے میری ساری شخصیت اور میرے نظریۂ علم کو یکسر بدل دیا - مجھے کالج میں حاصل کئے ہوئے نظری علوم کھوکھلے اور گھٹیا معلوم ہونے لگے - جرمن مادیت کے مقابلہ میں ، یونانی فلسفہ مجھے اپنی بے پناہ افادیت کے باوجود گھٹیا معلوم ہونے لگا - لاک ، بینتھم ، ہیوم اور دیگر انگلستانی مفکر نیم پختہ عقلیت پسند نظر آئے ، فرانس کے مادہ پرست میکانکی معلوم ہوئے ، کانٹ کے اخلاق کلیے اور ہیگل کا فلسفۂ تاریخ بالترتیب بے معنی عمومیت اور روحانیت کے ڈھنڈورچی نظر آئے -

جرمن مادیت سے مجھے کائنات کے بنیادی اصولوں کا شعور ہی نہیں ملا بلکہ اس سے مجھے مادی طاقتوں کے عمل اور رد عمل کا بھی پتہ چلا - معاشرتی ارتقاء کے متعلق سائینٹفک اور تفصیلی علم ملا - مجھے پتہ چلا کہ مارکسیت محض فن ہی نہیں بہت بڑی سائنس ہے - نظریہ نہیں ، عمل ہے - سرمایہ دارانہ نظام کا مٹ جانا اتنا ہی یقینی ہے ، جتنا تمازت آفتاب سے شبنم کا ناپید ہو جانا - اور عالمگیر اشتراکی انقلاب کا کامیاب ہونا اتنا ہی یقینی ہے ، جتنا بہار کے موسم میں رنگ برنگ پھولوں کا اجتماعی شان سے لہرانا -

''ان علوم نے میرے نظریہ ادب اور موضوعات پر فیصلہ کن

اثرات چھوڑے ۔ یہی وہ روشنی تھی جس سے میں آج تک اپنی ہیئتوں کو روشن کرتا رہا ۔ تاریخ کا مادی تجزیہ کرنے سے مجھے کئی ایسی سماجی روائتیں نظر آئیں جو ہزارہا سال سے انسان کو گھن کی طرح کھائے جارہی تھیں ۔ لیکن جنہیں بزدل اور توہم پرست انسان مضر اور غیر افادی سمجھنے کے باوجود اپنانے پر مصر تھے ۔ میری تمام نظمیں ، جن میں متروک سماجی قدروں پر نکتہ چینی کی گئی ہے اسی دور کے مطالعہ سے پیدا ہوئیں اور آج بھی یہ مطالعہ میرا سب سے بڑا محافظ ہے ۔ میں نے غلط قومی تصورات کی مخالفت کی اور سچی بین الاقوامیت کی حمائت کی ، میں نے الوہیت کے جامد تصور اور منظم مذہب کو حکومتی اداروں کا استحصالی آلہ سمجھ کر جھٹلایا ۔ زندگی کے مادی تصور کو شعر کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ۔ آمرانہ اور سرمایہ پرستانہ قانون کے کھوکھلے پن کو ظاہر کیا ۔ تقدیر کی جبریہ تشریحوں کی مذمت کی ۔ فطرت اور انسان کے باہمی رشتوں پر جدید اور صحت مند زاویوں سے روشنی ڈالی اور نچلے طبقوں کی اسٹ جد و جہد کو اجاگر کیا ۔"

میں ۴۲ء کے وسط میں رہا ہوا ۔ اب میرے ذہنی ارتقاء کا تقاضا تھا کہ براہ راست پرولتاریہ کی انقلابی آویزش میں شریک ہو جاؤں ۔ چنانچہ میں نے فوراً اپنے آپ کو مقامی ٹریڈ یونین سے منسلک کردیا ۔ مارکسی فلسفہ میں پرولتاریہ کو جو مقام حاصل ہے وہ اور کسی طبقہ کو نہیں ۔ اس طبقہ سے جدلی رشتے قائم کرتے وقت میں عظیم استعجاب کا شکار تھا ۔ پرولتاریہ ، جو غلیظ ، غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہے عالمگیر عوامی انقلاب کو کیسے کامیاب بنا سکتا ہے ؟ ابتدا میں یہ سوال اپنی پوری قوت سے میرے ذہن میں ابھرتا رہا ۔ لیکن جب میں نے پرولتاریہ کو قریب سے دیکھا ، اس کے دل میں جھانکا ، اس کے ضمیر کو ٹٹولا ، تو میں اس کی انقلابی قیادت کو موجودہ دنیا کا اٹل فیصلہ سمجھنے لگا ۔

میں ۱۹۴۵ء کے وسط تک مقامی ، صوبائی اور کل ہند مزدور تنظیموں میں کام کرتا رہا ۔ اس عرصہ میں مجھے ' نقص امن ' اور ' بلوے ' کے الزام میں دوبار گرفتار بھی کیا گیا ۔ میرے والدین

میری سیاسی سرگرمیوں سے خائف ہو کر مجھے ۱۹۴۶ء ہی میں گھر سے نکال چکے تھے ۔ اس لئے مزدور سرگرمیوں کا سارا زمانہ میں نے ایک تنگ و بوسیدہ کمرے میں بسر کیا ۔ جو ضلع ٹریڈ یونین کے دفتر کی آخری چھت پر تھا ۔ اس کمرہ کے بیرونی دروازے کا بالائی حصہ بالکل کھلا تھا ، اور تالہ لگانے کے باوجود دو موٹے تازے آدمی بیک وقت کمرہ میں داخل ہو سکتے تھے ۔ اس کمرہ سے کئی بار میری کتابیں چوری ہوئیں ۔ ایک دفعہ کوئی آرٹسٹ چور دیوار پر لگی دو آئیل کلر تصویریں آتار کر لے گیا.........اس کمرہ کو میرے دوست مذاق سے Dr. Johnson's Garret کہا کرتے تھے ۔

اس دور میں کل ہند بھکنہ کسان کانفرنس میرے ادبی شعور کے لئے تازیانہ ثابت ہوئی ۔ اس کانفرنس میں ایک مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا تھا ۔ میں نے اس مشاعرے میں ایک خالص سیاسی نظم پڑھی۔ کانفرنس کے خاتمہ پر قریباً ۵۰۰ مندوبین اور مقامی کارکنوں کے سامنے خود تنقیدی کرتے ہوئے پنجاب کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری سوہن سنگھ جوش نے مذکورہ نظم پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا ....شاعر کے لئے بہتر تھا کہ وہ یہ نظم لاہور کے کسی گرلز کالج میں سنا آتا ۔ اس فقرے سے میرے فنی غرور کو بہت ٹھیس لگی ۔ میں اس فقرہ کا اصل مفہوم تو نہ سمجھ سکا ۔ لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ میں مارکسی طرز تنقید سے ضرور واقفیت حاصل کروں گا ۔ چنانچہ میں نے مارکسی تنقید کو اپنے مطالعہ کا مستقل موضوع بنا لیا ۔

میں نے مارکس اور اینگلز کی جمالیاتی تصریحات کو سمجھا ، لینن کے نظریہ عکس سے فیض حاصل کیا ۔ گورکی کی اشتراکی شیئیت پسندی سے اکتساب فن کیا اس کے علاوہ میں نے امریکہ ، برطانیہ اور روس کے جدید ناقدوں جیمز ٹی فیرل ، ایلک ویسٹ ، رالف فوکس ، کڈویل ، لیہان ، میکائل لفٹز ، وی کیمی نوف وغیرہ کو بھی جستہ جستہ دیکھ ڈالا ۔

میں جس تنقیدی کتاب کا مطالعہ کرتا ، اس کے اقتباسات با قاعدگی سے محفوظ کرتا جاتا ۔ اور پھر ان اقتباسات سے تنقیدی مضمون مرتب کرلیتا ۔ میرے یہ تنقیدی مضمون عدیم الفرصتی کے باعث

اگرچہ کہیں کہیں تشنہ اور نامکمل رہ جاتے۔ اس کے باوجود ملک کے ادبی حلقوں نے انہیں بہت پسند کیا۔ اور یوں میں نے ادبی تنقید کے موضوع پو با قاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔

"اس دور میں مجھے احساس ہوا۔ کہ آرٹ اپنے عمومی اور پائندہ حسن کے باوجود جماعت اور وقت کا پابند ہوتا ھے۔ کلاسیکی موضوعات ھی شعر و ادب کا لازمہ نہیں۔ وقتی اور ھنگامی عنوانوں میں بھی لازوال فنی قدریں پیدا کی جا سکتی ھیں۔ اس خیال سے متاثر ہو کر میں قومی اور بین الاقوامی ھنگاموں سے موضوع تراشنے لگا۔ میں نے دوسری عالمگیر جنگ کے سامراجی دور پر شعر کہے۔ جنگ کے عوامی دور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی، سیباسٹپول کے شہیدوں کی بے مثال بہادری کا تذکرہ کیا۔ یورپ کے سرخ انقلاب کو نظمایا........وغیرہم۔"

۱۹۴۵ء کے وسط میں میرے نجی معاملے اس طرح الجھ گئے کہ مجھے اکتساب فن نہیں، اکتساب زر کے لئے لاھور آنا پڑا۔ یہاں میں ادبی صلاح کار کی حیثیت میں فلم کمپنیوں سے منسلک ھو گیا۔ اس ماحول میں آکر مجھے یوں محسوس ھوا جیسے کوئی سپاھی لینن گراڈ کا مورچہ چھوڑ کر ھالی وڈ میں گھٹیا قسم کا عشق فرمانے چلا آیا ھو۔ اب میرے ارد گرد مزدور نہ تھے۔ شہرہ آفاق سٹہ باز تھے۔ میرے دفتر کی میز پر Das Capitol نہ تھا ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں۔ یہاں بحثوں کا موضوع، انسانی ارتقاء یا فلسفۂ اجتماع نہ تھا۔ پروڈکشن کے میزانئے تھے یا نگار خانوں کے رومان۔

"لاھور میں اس وقت حلقہ ارباب ذوق کے علاوہ اور کوئی ادبی ادارہ نہ تھا۔ چنانچہ میں ایک مدت تک اس ادارہ کی محفلوں میں باقائدگی سے حصہ لیتا رھا۔ لیکن ان سے ایک لمحہ کے لئے بھی متاثر نہیں ھوا۔ اس ادارہ میں ھیئت اور موضوع کے اعتبار سے کئی رجحان پائے جاتے ھیں۔ اور سب رجحان بنیادی طور پر Formalism کی طرف لے جاتے ھیں۔ اس ادارہ کے اکثر مشہور فن کار قنوطی ھیں۔ وہ مٹتی ھوئی انٹرنیشنل برجوازی کی لذت مرگ، جموریت، اور جنسی انتشار کو کمال فن سمجھتے ھیں۔ ان کے اکثر ادب پارے مغرب کے

فرائڈ پرستوں کی بھونڈی نقل معلوم ہوتے ہیں - اس ادارہ میں کچھ فنکار ایسے بھی ہیں - جنکے پاس کوئی واضح نصب العین یا نظریۂ حیات تو کجا اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح فرائڈ پرستی بھی نہیں - وہ ذہنی طور پر ابہام اور الجھن کے شکار ہیں - اور اسے چھپانے کے لئے شعروں کی بجائے بجھارتوں سے قاری کا دل بہلانا چاہتے ہیں - ان میں کوئی تو سوریل ازم کو فن کی معراج سمجھے ہوئے ہے ، اور کوئی محض جمالیاتی قدروں کو ہی فن کی اساس سمجھتا ہے........میں اس ادارہ کی محفلوں میں جتنی بار بھی شریک ہوا - ادبی گستاخی کا مرتکب ہوا - میرا انداز تنقید ہمیشہ مارکسی رہا - اور میں اپنے فن کے زندہ فلسفے سے اهل محفل کو متاثر بھی کرتا رہا - چنانچہ میرا مضمون ' اردو نثر کا سماجی پس منظر ' جو خالص اشتمالی نظر سے لکھا گیا تھا حلقه کی سالانه کانفرنس میں سال کا بہترین مضمون قرار پایا - اور مجھے ۳۳ روپے ۵ آنے ٦ پائی کی رقم بطور انعام بھی دی گئی -"

اسی اثناء میں ۱۹۴۷ء کا مہیب سال آن پہنچا ، برطانوی شہنشاہیت نے ہندوستان کے چالیس کروڑ انسانوں کو مارشل پلان کے عوض ' مسلم بڑوں ' اور ' ہندو بڑوں ' کے ھاتھ نیلام کر دیا - بہار ، بنگال ، اور نواکھلی میں تو انسانیت پہلے ہی شہید ہو چکی تھی - اب پنجاب کی زمین پر بھی آگ اور خون کے بادل چھاگئے - ہیر کا رنگیلا چرخه هیر کی چتا بن گیا - ترنجن میں رانجھا اپنے سریلے گیتوں کے ساتھ دفن کر دیا گیا - چناب سانپ کی طرح بل کھا کر سرخ ہو گیا - آن کی آن میں پانچ دریاؤں کے رومان کسی بیوہ کے سہاگ کی طرح اجڑ گئے -

تقسیم ہند کی خبر سن کر میرا خاندان امرتسر سے بھاگا لیکن لاهور صحیح و سالم نه پہنچ سکا - راسته میں میرے ایک چچا اور دو جوان چچیرے بھائی قتل کر دئے گئے - ادھر لاهور میں فلمی صنعت پر بحران چھا چکا تھا - وہ اقتصادی اور سماجی رشتے جو مجھے سالوں سے ایک خاص انداز میں ڈھال رہے تھے ، آناً فاناً ٹوٹ گئے - میرا ماحول یکسر بدل گیا - اب میرے سامنے مرتا ھوا انسان تھا یا

برطانوی سامراج کی شیطانی سیاست تھی ۔ جو مجھ پر اور ہر غیر سیاسی بھارتی اور پاکستانی پر زبردستی ٹھونس دی گئی تھی ۔

اب میرے ذہن کے نچلے خانوں سے وہ تمام انسانیاتی علوم آہستہ آہستہ ابھرنا شروع ہوگئے ۔ جنہیں میں کچھ عرصہ کے لئے بالکل فراموش کر چکا تھا ۔ میں نے دوبارہ سیاسی لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا اور دوسری عالمگیر جنگ سے پیدا ہونے والے قومی اور بین الاقوامی سیاسی محرکات کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنا لیا ۔

اس مطالعہ نے میری ذہنی گند لاھٹیں دور کر دیں ۔ میں اپنے آپ کو قوی اور تازہ دم محسوس کرنے لگا ۔ اور میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین میں کام کرنا شروع کردیا ۔

اس دور میں میری نظمیں زیادہ واضح ہو گئیں میرا انداز تحریر زیادہ تیز ہو گیا اور میری تخلیقی رفتار میں عددی اضافہ ہوا ۔ میں نے جھوٹی آزادی پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ۔ جنوب مشرق ایشیا کی انقلابی تحریکوں سے مواد کشید کیا وغیرہ وغیرہ .... اس دور میں میں نے سہل زبان کے سیاسی گیت بھی لکھے، جن میں مقامی اور وقتی موضوعات شامل تھے ، میری غزل آج تک کم و بیش عشقیہ مطالب کے گرد ھی گھومتی تھی ۔ لیکن اس دور میں میں نے خارجی غزلیات کو پوری طرح اپنانے کی کوشش کی اور اسلوب یہ رکھا کہ علامتیں تو کلاسیکی ھی رھیں لیکن جدید موضوعات کے مطابق انہیں نئے مطالب اور نئے تلازموں کے ساتھ پیش کیا جائے ۔

میں نے اس وقت تک جو کچھ بھی لکھا ھے ۔ اس میں اگر کوئی فکری عظمت یا ھئیتی چابک دستی ھے تو وہ انسانیت پرستی ایسے آدرش کی مرھون منت ھے ۔ میری تخلیقات میں اگر کوئی فنی پائندگی ھے تو وہ مشرق و مغرب کی پائندہ انقلابی تحریکون کی بخشی ہوئی ھے ۔

آج میری لڑائی ان ھزار ھا دانشوروں اور فنکاروں کی لڑائی ھے جو اقتصادی اور تہذیبی طور پر انسان کو آزاد کرانا چاھتے ھیں ۔

ظہیر کاشمیری

(ماخوذ از 'سویرا' شمارہ نمبر ۹)

بـامن آویزش اُو الفتِ موج است و کنـار
دم بدم بـامن و هر لحظه گریزان از من

لالہ رخ

نگاہ میں آتشیں شرارے
شباب کی جھلکیاں جبیں میں
بہار تحلیل ہو رہی ہے
صباحتِ زلفِ عنبریں میں

نقاب کی دلکشا تہوں میں
نہاں کئی نقرئی نظارے
تجلیاں یوں برس رہی ہیں
کہ شرم سے ٹوٹتے ہیں تارے

سیاہ ، باریک آنچلوں میں
کلائیاں جھلملا رہی ہیں
جفاؤں کا سیل آرہا ہے
جوانیاں کپکپا رہی ہیں

ہزارہا فکر اس سراپا کے ساتھ محوِ خرام ہوں گے
کئی نیاز آفرینیوں پر بہار کے دن حرام ہوں گے

غزل

تیری چشمِ طرب کو دیکھنا پڑتا ہے پُرنم بھی
محبت خندۂ بے باک بھی ہے گریۂ غم بھی

تھکن تیرے بدن کی عُذر کوئی ڈھونڈھ ھی لیتی
حدیثِ محفلِ شب کہہ رہی ہے زلفِ برہم بھی

بقدرِ دل یہاں سے شعلۂ جاں سوز ملتا ہے
چراغِ حسن کی لوَ شوخ بھی ہے اور مدھم بھی

میری تنہائیوں کی دل کشی تیری بلا جانے
میری تنہائیوں سے پیار کرتا ہے تیرا غم بھی

بہاروں کے غزلخواں آج یہ محسوس کرتے ھیں
پسِ دیوارِ گل روتی رہی ہے چشمِ شبنم بھی

قریب آتے مگر کچھ فاصلہ بھی درمیاں رہتا
کمی یہ رہ گئی ہے باوجودِ ربطِ باہم بھی

ظہیر، ان کو ھمارے دل کی ہر شوخی گوارا تھی
انہیں کرنا پڑے گا اب ھمارے دِل کا ماتم بھی

نرتکی

جھنن جھنن گھنگھرو جھنکارے
چونک اٹھے ، خلخال ، ستارے

تان اڑی ، مِسی مُسکائی
چوٹی ، ناگن سی لہرائی

کوند گئے آنکھوں کے اشارے
جاگ اٹھے، کاجل کے دھارے

خود ہنس کر پلو ڈھلکایا
لچکی اور کنگن کھنکایا

بہکی سی اک تان اڑا کر
جھانجھ ذرا ہولے جھنکا کر

ایڑی کے بل پر لہرائی
داد ملی — گردن نیہوڑائی

پھر دونوں کولہے مٹکا کر
محفل پر آنکھیں بکھرا کر

سیندھوری آنچل پھیلایا
چھم چھم، چھم چھم — تال بتایا

شوخی کی ، ٹھوکر سی کھائی
گرتے گرتے لی انگڑائی

اٹھی — جھومی — سمٹی — چھائی
بجلی سی تیزی دکھلائی

آخر یک دم ، چھم چھم کرکے
بھاگ گئی پردے کے پیچھے

☆

ربودگی

کھڑکیوں کے نحیف شیشوں پر
کپکپاتے ھیں شام کے سائے
سوچ میں ھیں کچھ ایسے محرابیں
جیسے کوئی کسی سے کھو جائے

غزل

ساغر اچھل رہے تھے جدھر دیکھتے رہے
ہر شے میں ان کا حُسنِ نظر دیکھتے رہے

گلُشن کو ہم برنگِ دگر دیکھتے رہے
ہر گام پر خزاں کا خطر دیکھتے رہے

ہم نے تو کروٹوں میں جوانی گزار دی
حسرت سے بزمِ غیر کا دَر دیکھتے رہے

وہ جنبشِ نقاب کا منظر نہ پوچھئے
کیا دیکھنا تھا اپنا جگر دیکھتے رہے

وہ بار بار دل میں جلاتے رہے چراغ
ہم سر جھکائے شمعِ سحر دیکھتے رہے

محسوس ہورہا تھا کوئی سلسلہ ظہیر
پہروں زمینِ راہ گزر دیکھتے رہے

رخصت

یہ پنگھٹ، یہ سرد ہوائیں
یہ ساون، یہ مست گھٹائیں
یہ بھیگی، پر نور فضائیں
کتنا کیف آور ہے زمانہ
آج کی باتیں بھول نہ جانا

کھیتوں کے رنگین نظارے
دریا کے خاموش کنارے
پربت اور وادی کے اشارے
کہتے ہیں عشرت کا فسانہ
آج کی باتیں بھول نہ جانا

گستاخی، بے سود حیائیں
چاک گریباں، تنگ قبائیں
آنسو اور مدھوش ادائیں
کتنا دلکش ہے یہ فسانہ
آج کی باتیں بھول نہ جانا

بانہوں کی رنگیں عُریانی
آنکھوں میں بے ہوش جوانی
ہونٹوں پہ بچپن کی کہانی
یہ رت، یہ سِن اور یہ زمانہ
آج کی باتیں بھول نہ جانا

چھوڑو مایوسی کی باتیں
دیکھو یہ بھیگی برساتیں
تنہائی میں پیار کی باتیں
پھر لوٹ آئے گا یہ زمانہ
آج کی باتیں بھول نہ جانا

☆

سائے

منتشر زُلف، بکھرتی ہوئی زُلف
خواب، الجھے ہوئے، چھائے چھائے
ذہن کی لوح پہ دھندلے سے خطوط
دل کی محراب پہ سائے سائے

غزل

تم لہراؤ برساتوں میں تم رقص کرو پیمانوں میں
کیا ڈھونڈتے ہو کیا پاؤ گے ان درد بھرے افسانوں میں

ساون کی سنہری راتوں میں ماضی نے یہیں دم توڑا تھا
کچھ ٹیسیں ہیں، کچھ آنسو ہیں، ان عشرت کے سامانوں میں

پھر چشم اٹھی ،پھر لہرا کر ، ساقی نے تبسم فرمایا
پھر دامنِ دل کا ہوش نہیں ، اس محفل کے فرزانوں میں

طوفانِ خرد سے بچ نکلے ، مستی کا ساحل ڈھونڈ لیا
جس دن سے جوانی ڈوب گئی ، میناؤں میں پیمانوں میں

دل ہو تو ظہیر اس محفل میں طوفانِ تکلم ہوتا ہے
عاقل کے لئے تو پتھر کی تصویریں ہیں بُت خانوں میں

شاھدہ

کسی سنولائی ہوئی شام کی تنہائی میں
دو سرکتے ہوئے سایوں میں ہوئی سرگوشی
بات چھوٹی تھی — مگر پھیل کے افسانہ بنی

میں نے اکثر یہی سوچا — تیرا خوش رنگ بدن
نقرۂ ناب کا ترشا ھوا ٹکڑا ھوگا
دودھیا — سرد — حرارت سے تہی
جس پہ طاری ھو خود اپنے ھی تصور کا جمود
کوئی اعجازِ پرستش جسے چونکا نہ سکے

تو مگر پھول کی پتی سے سبک تر نکلی
اوس کے لمس سے جو آپ ھی جھک جاتی ھو
اک ھلورہ بھی جسے ٹھیس لگا سکتا ھو
تو مگر خوابِ محبت تھی فرشتوں نے جسے
بیٹھ کر چاند ستاروں میں بُنا صدیوں تک
اپنے بِلّور کے ایوان سجانے کے لئے !

دمِ گفتار — تیرے ہونٹوں سے رستی ہوئی بات
جیسے یاقوت کی سِل چیر کے جھرنا پھوٹے
اور گیتوں کے بہاؤ میں مخاطب کو لئے
چھوڑ آئے کہیں رومان بھری وادی میں
تیری شب تاب جوانی کی ضیا نے اکثر
ہالۂ نور میرے گرد کیا ہے تعمیر
اور میں حُجلۂ تنویر میں پہروں بیٹھا
تیرے مانوس تنفس کی صدا سنتا رہا

ابھی کچھ اور بھی راتیں ہیں پسِ پردۂ غیب
ابھی کچھ اور بھی نغمے ہیں پسِ پردۂ ساز
کئی راتوں کئی نغموں سے گزرنا ہوگا
دیکھ ! وہ چاند کی چوٹی کا چمکتا مینار
اسی مینار میں دونوں کو پہنچنا ہوگا

غزل

تزئینِ حُسن ہے کہیں تقریبِ ناز ہے
اے ہوش مند سلسلۂ غم دراز ہے

مدت کی راہ و رسمِ محبت کے باوجود
وہ حُسنِ آشکار ابھی ایک راز ہے

اے دوست صرف حسرتِ پروانہ کو نہ دیکھ!
یاں شمعِ انجمن کا بھی زہرہ گداز ہے

اس بزم میں فریبِ نظر کی کمی نہیں
محوِ نیاز ہے تو کوئی محوِ ناز ہے

میں جانتا ہوں اصلِ نیاز و ادا ظہیر
میری نظر میں رازِ نشیب و فراز ہے

انقلابِ روس

یک بیک — سرخئ افکار کا لاوا پھوٹا
اسقف و زار کے دامن کو جلانے کے لئے
پا بہ زنجیر غلاموں نے کیا عزمِ جہاد
اپنی لاشوں پہ نئے شہر بسانے کے لئے

وقت کی ڈوبتی نبضوں میں حرارت آئی
زرد چہروں نے لیا قوتِ شاہی سے خراج
ایک مجبور سی تدبیر بدل سکتی ہے
خوف و بیداد کا راج — آتش و آہن کا رواج

ابنِ آدم کی حمیّت نے سنایا پیغام
«اب نہ دربار میں بِکنے کی اجازت ہوگی
کوئی فرعون اگر تیغ پہ اِترائے گا
آشتی کا یہ تقاضا ہے، بغاوت ہوگی —»

روس! یہ دور تیرے نام سے پائندہ ہے
تیرے بیٹوں نے کیا نعرۂ جمہور بلند
ظاھراً قافلۂ مور و ملخ تھے لیکن
ڈال دی قصرِ سلیماں پہ عزائم کی کمند

غزل

وہ اکثر باتوں باتوں میں اغیار سے پوچھا کرتے ھیں
یہ سر بہ گریباں دیوانے کس شے کا تقاضا کرتے ھیں

اک دن تھا کہ ساحل پر بیٹھے طوفاں پہ تبسّم کرتے تھے
اب مایوسی کے عالم میں ساحل کا تماشا کرتے ھیں

خطرہ ھے وفا کے لٹنے کا ، مجبورئ دل بھی لازم ھے
جینے کی تمنا کرتے ھیں مرنے کا تقاضا کرتے ھیں

معصوم ستمگر کی باتیں ، مظلوم ادا کے افسانے
یوں رات بسر ھوجاتی ھے ، یوں دل کا مداوا کرتے ھیں

جب نادانی کا عالم تھا حاصل کی تمنا کرتے تھے
اب دل میں آگ لگاتے ھیں شعلوں کا تماشا کرتے ھیں

اپنے میں رھے تو رسوائی ، اپنے سے گئے تو سودائی
ھم مدت سے دیوانگئ دنیا کا تماشا کرتے ھیں

فن کار

اگلے وقتوں کے پر اسرار عبادت خانے
جن کی بے نُور ، سنبھلتی ہوئی محرابوں پر
کئی مرحوم خداؤں کے نشاں ملتے ہیں
وہ خدا بیت چکے جن کے مہیب افسانے
وہ خدا ٹوٹ چکے جن کی خدائی کے طلسم
آج ہر سنگ پہ منقوش یہاں ملتے ہیں

یہ چمکتے ہوئے ایواں ، یہ فلک بوس محل
جن کو صدیوں کے تمدن نے سلامی دی ہے
قہقہے گونجتے ہیں جن کے طرب خانوں میں
اب بھی ہے جن سے عیاں قیصر و سلطان کا مذاق
اب بھی ہے مے کا اثر جن کے شبستانوں میں

کسی شاعر کے تصوّر نے کیئے ہیں پیدا
یہ محلات و معابد ، یہ خداؤں کے نقوش
یا ان اشیائے طلسمی میں ہوا ہے تبدیل
مرمریں سحر کسی گزرے ہوئے ساحر کا

کون فن کار ہے تہذیب کے پس منظر میں
جس کے ہر فن سے جھلکتی ہے تمنائے جمیل!

جسم داغا ہوا، انگاروں پہ لوٹایا ہوا
آنکھ بے نُور، جبیں زرد، گریباں صد چاک
آہ کس حال میں فن کار کو دیکھا میں نے
بال نوچے ہوئے، تنہائی میں پھنکوایا ہوا
تُند طوفانِ بلا — اور یہ بجھتا سا چراغ
ایک مرتے ہوئے بیمار کو دیکھا میں نے

آہ کس حال میں فن کار کو دیکھا میں نے

غزل

لب نہ ہلے ، آنسو نہ بہے　　دل ہی دل کی بات سہے

غم سے جب بھی چھیڑ چلی　　جھرنے، جھر جھر، پھوٹ بہے

اپنے تھے یا دُور - پرائے　　سب نے تیکھے بول کہے

نبضیں تھک کر ڈوب گئیں　　کون اب کس کی بات سہے

گھڑی گھڑی باتیں تھیں　　تنہا تنہا پھوٹ بہے

اِس کا فقرہ ، اُس کی بات　　دل نے سب الزام سہے

ہم ہی کچھ دیوانے ہیں　　کون پرائی چوٹ سہے

کس دنیا نے ساتھ دیا　　کس دنیا کی لاج رہے

دیکھ ظہیر ان آنکھوں نے
کتنے تیکھے بول کہے

پازیب

تونے جب عہدِ جوانی میں قدم رکھا تھا
کئی شعلے تیرے سینے میں بھڑک اٹھے تھے
تونے سُلگی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا تھا

چوٹ کے ساتھ اُجالا ہوا ، ارمانوں میں
کپکپاتی ہوئی تخئیل نے دیکھا جیسے
برق سے آگ لگا دی گئی طوفانوں میں

چھم چھما چھم کی صدا کان میں لہرا سی گئی
تیری کھوئی ہوئی پازیب کہیں بَجتی تھی
تیری پازیب کہیں اور ؟ — حیا آ سی گئی

میری خود رنگ طبیعت پہ جلال آنے لگا
شاہزادی سے غرض ؟ — مجھ کو مری شے سے غرض
یوں شہنشاہ کے ناموس سے ٹکرانے لگا

جرمِ انصاف میں جب طوق و سلاسل کا اسیر
کوچۂ سرد سے گزرا تو ادھر چلمن سے
ٹپ ٹپانے لگی جلتے ہوئے اشکوں کی لکیر

تجھ سے پہلے تیری پازیب کو حاصل کر لوں
مجھ پہ الزام نہ دے فرض سے مجبور ہوں میں
سیل کے واسطے تیاریٔ ساحل کر لوں

ڈھونڈ لوں وقت کی الجھی ہوئی رفتاروں میں
تاکہ تو جب بھی میرے سامنے ہو محوِ خرام
روح لہرائے لرزتی ہوئی جھنکاروں میں

ذہن کی لوح پہ اب بھی تو نظر آتے ہیں
تیری شب تاب جوانی کے شعاعی خد و خال
تیری پازیب مگر — تیر چُبھے جاتے ہیں

غزل

صیدِ خزاں نہ تھے تو اسیرِ بہار تھے
کانٹوں سے بچ گئے تو گلُوں کا شکار تھے

ساقی کی التجائے نظر تھی وگرنہ ہم
دل کے معاملے میں بڑے ہوشیار تھے

کچھ ان کا فیض اور کچھ اپنی پسند تھی
بیٹھے تو فرشِ راہ اٹھے تو غبار تھے

جینا پڑا کہ اپنی وفا کا خیال تھا
ورنہ ہر اک عزیز کی خاطر پہ بار تھے

ہر گام بجلیوں سے الجھنا پڑا ظہیر
ہم وہ اسیر دائیرۂ اختیار تھے

شاعر

کوہ کے نیم سرد سایوں میں
شام چپ چاپ، پھیل جاتی ہے
سنگ در سنگ — تیز تنہائی
جگنوؤں کے دیئے جلاتی ہے
دفعتہً سامنے چٹانوں سے
کُہر آلود چاپ آتی ہے

دُور — بستی سے ایک دیوانہ
ان چٹانوں پہ روز آتا ہے
کسی اُلجھی ہوئی گُپھا کے پاس
مست، خاموش بیٹھ جاتا ہے

ذہن کی بے کراں حرارت میں
جسم ڈھل کر لطیف ہوتا ہے

وقت اور فاصلہ؟ — طلسمِ خیال
چوٹ کے ساتھ ٹوٹ جاتا ہے

تجربہ ، خواب ناک عالم میں
اجنبی وادیاں دکھاتا ہے

رنگ در رنگ استعاروں میں
سوچتا ہے اُداس دیوانہ
«ــ کس قدر غیر شاعرانہ ہے
زندگی کا طویل افسانہ
حُسن کی عادتیں جفا بہ نظر
عشق کی خصلتیں بہیمانہ
عقل کی ظُلمتیں شرار آمیز
دین کی نعمتیں گدایانہ

کئی مجذوب عہدِ گل کے لئے
خون کا دے چکے ہیں ندرانہ
لیکن اب بھی نصیب ہو نہ سکا
پھول کا ہفت رنگ پیمانہ

آدمی بے خبر رہا ورنہ
مہر کی چشمکیں شکار کرے
ماہ کو چھین کر ستاروں سے
اپنی محفل میں نُور بار کرے

رات کے ہولناک سایوں میں
آشتی کا چراغ لے آؤ
اور یونہی بڑھ چلو قدم بہ قدم
گیت گاؤ ! ایاغ چھلکاؤ — »

کوہ کی اوٹ سے طلائی کرن
جھانکتی ہے گلاب زاروں میں
روشنی کے انار چھٹتے ہیں
دُور — پھیلے ہوئے چناروں میں

یک بیک — سحر ٹوٹ جاتا ہے
مرمریں — احمریں — خیالوں کا

غزل

شبِ مہتاب بھی اپنی ، بھری برسات بھی اپنی
تمہارے دم قدم سے زندگی تھی زندگی اپنی

مجھے شادابئی صحنِ چمن سے خوف آتا ہے
یہی انداز تھے جب لُٹ گئی تھی زندگی اپنی

تمہارا غم اسے آشوبِ صر صر سے بچالے گا
ہواؤں سے بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگی اپنی

یہاں پابندئ ناز و جنوں کی بات ہے ورنہ
جمالِ یار سے کچھ کم نہیں تابندگی اپنی

مگر تم بھی تو اک بُوئے گریزاں کی طرح نکلے
گزرنے کو گزر جاتی ، بہارِ دوستی اپنی

ظہیر اس چشمکِ اول پہ یوں محسوس ہوتا ہے
بڑی مدت سے ہے جیسے کسی سے دوستی اپنی

دوسری عالمگیر جنگ

احمریں سایوں کے نیچے ، سُرمئی راھوں کے پاس
جس جگہ سے رینگ کر چلتے رھے ھیں سِن و سال
ساحرِ افرنگ دِیبا کی عبا پہنے ہوئے
مدتوں بُنتا رھا بے روح تدبیروں کے جال

حیفه و پریاگ کی تقدیر ، مظلوموں کی موت
خون میں لتھڑے ہوئے بے روح تدبیروں کے جال
ملّتِ احمر نے ٹھکرا کر پریشاں کر دیئے
جال ، بن جاتے و گرنہ خوابِ عشرت کا مآل

ساحرِ افرنگ خود اپنے طِلسموں کا اسیر
سر جھکائے پنجۂ احمر میں آکر رہ گیا
وقت نے زنجیر پھیلادی کچھ اس انداز سے
خود نگر بے آب خنجر کو اُٹھا کر رہ گیا

چھِن چکی ہے دیوتاؤں سے نقابِ ریشمی
دیوتا بے رنگ چہرے کو چھپا سکتے نہیں
نُقرئی سکّے ، طلائی مسندیں ، بے فائدہ
چند تنکے سرخ طوفاں کو دبا سکتے نہیں

آگ کے شعلے ، دھماکے ، موت ، ہرچہ بادا باد
دیکھ فسطائی درندوں کا جنونِ برتری
آج ایوانِ کُہن دُھنکا پڑا ہے خاک پر
اور ایوان کُہن کا ہے یہ سنگِ آخری

کوند جاؤ ! — سنگِ آخر کا نشاں مٹ جائے گا
یہ جہانِ کُہنہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے
وہ اُفق پر کچھ نئی سرگوشیاں ہونے لگیں
ظلم کے سائے پگھلتے ہیں سحر ہونے کو ہے

غزل

سناتے ہوئے میکشی کے ترانے
انہیں بھی پلادی بہانے بہانے

جوانی کا عالم ، محبت کی گھاتیں
سنہری زمانہ ، سنہری فسانے

کوئی برق پہلو سے لہراگئی تھی
مہینوں سُلگتے رہے آشیانے

حجابِ شبانہ کہیں رہ سکے گا
خود اٹھیں گے دامن سے شمعیں بجھانے

یہ اُڑتے ہوئے آنچلوں کا تموّج
یہ بھکے ہوئے میکشی کے زمانے

کوئی دلنشیں داستاں کہہ رہے ہیں
نشاطِ شبِ وصل سے چُور شانے

ظہیرِ پریشاں کی حالت تو دیکھو
اسے عشق میں کیا ہوا ہے نجانے

تحریکِ نو

طارق و مریخ کو دیکھ!

جن کی ہر چال قیامت تھی زمانے کے لئے
ٹوٹ کر خاک میں تحلیل ہوئے جاتے ہیں
نئے مضمون ہیں فردا کے فسانے کے لئے

کون جلائے گا چراغ ۔ ؟

آندھیاں پیچ و خمِ راہ سے ٹکراتی ہیں
آشیانوں پہ بگولوں نے کمندیں ڈالیں
بجلیاں گونج کے پہلو سے گزر جاتی ہیں

چراغ

(سیباسٹپول کے شہیدوں کی نذر)

بُجھ گئے کئی چراغ
شہر کی فصیل پر
السلام — اے سحر

آندھیوں کے درمیاں
اُن کا رقص، رقصِ ناز
اُن کی لَو، جگر گداز
چشمکِ مراد میں
جل کے بجھ گئے مگر
السلام — اے سحر

جھلملا کے بجھ گئے
تیری بات رہ گئی
کٹ کے رات رہ گئی
آچکا ہے کارواں
زندگی کے موڑ پر
السلام — اے سحر

تارا

دیکھ یہ کار زار ! یہ پیکار !!
تیر گرتے ہیں ، تیغ اُبھرتی ہے
یہ دھواں ، یہ شرر ، یہ زنجیریں
زندگی موڑ سے گزرتی ہے

سرخ تارا اُبھرنے والا ہے
دُور اُن اجنبی خلاؤں میں
دلِ ہر ذرہ چونک اُٹھے گا
احمریں ، احمریں ، فضاؤں میں

غزل

مجھے زیست کی تلخیاں بھی گوارا
ارے دلفریبا ، ارے نَو بہارا

بہاروں کے رنگیں نظاروں نے مارا
بڑے کام آیا خزاں کا سہارا

یہ سیلِ بلا ہے مگر اہلِ ساحل
میں مجبور ہوں چھوڑتا ہوں کنارا

چمکتے خلاؤں پہ خوش ہونے والے
اگر پھر کوئی ٹوٹ جائے ستارا

فضائے چمن مہرباں ہو چلی تھی
نشیمن نے خود بجلیوں کو پکارا

ظہیر ، آہ وہ حادثوں کا زمانہ
جسے ہم نے اپنا سمجھ کر گزارا

تخت و الہام

راہبِ سرد نے گھڑیال پہ جب چوٹ لگائی
تھر تھرا ، اُٹھے کلیسا کے مفکّر در و بام
ظلمت و خوف میں لپٹی ہوئی محرابوں سے
چند دھندلائے ہوئے جسم بڑھے ، گام بہ گام

دست و پابستہ کلیسا کی کنواری بہنیں
بجلیاں حلقۂ زنجیر میں کَس کر لائے
کوئی بھکی ہوئی مسند سے پکارا — « لے جاؤ
لغزشِ دیں کے عوض آگ میں ڈالا جائے گا — »

دین کی آڑ میں حل ہونے لگا ہو نہ سکا
ساحلِ روم کی زرکار سیاست کا سوال
اور یوں ارضِ مقدس کے ہر اک کوچے میں
خونِ انساں میں نہائے تھے صلیب اور ہلال

عہدِ وسطیٰ کے خداوند ، وہ شاہانِ فرنگ
دین کو تخت کا پابند بنا ڈالا تھا
حفظِ جاگیر کی خاطر کئی انسانوں کو
نامِ تثلیث پہ شعلوں میں جلا ڈالا تھا

دین مجھ تک رہا محدود ، تو سینے کا چراغ
دین تنظیم میں آجائے تو اُلجھا ہوا جال
اور اگر شاہ کے دربار میں آکر جُھک جائے
کبھی خوں رنگ بجھارت ، کبھی تاریک سوال

☆

دو شعر

ھجر کے لمحوں میں اُس رنگیں تبسم کا خیال
برق رہ رہ کر چمکتی ھے اندھیری رات میں
پھر وفا کے بھیس میں خونِ جگر کرنے لگے
مسکرا کر تلخیاں بھرنے لگے جذبات میں

غزل

ترتیبِ گلستاں خوب سہی ، ترتیبِ گلستاں بدلے گی
جب وسعتِ امکاں بدلی ہے تقدیرِ بہاراں بدلے گی

آئینہ گرو ! شانہ سازو !! تدبیر کی ناکامی پہ ہنسو !
اب زلفِ پریشاں بھی اپنے اندازِ پریشاں بدلے گی

سورج کا سبو ، کرنوں کی چھلک ، یہ خاص سحر کی چیزیں ہیں
جب رنگِ شبستاں ہی نہ رہا ، تہذیبِ شبستاں بدلے گی

اے حسنِ جہاں بیچارگیٔ آشفتہ سراں پر طنز نہ کر
اب شکلِ گریباں بدلے گی اب صورتِ داماں بدلے گی

وہ اور کوئی طوفاں ہوں گے جو رک بھی گئے جو تھم بھی گئے
اب نوح کا طوفاں آئے گا کیفیتِ طوفاں بدلے گی

بجلی کا خطر ، صرصر کا اثر ، ان سے تو ظہیر اب خوف نہیں
دستور گلستاں بدلے گا ، رُودادِ گلستاں بدلے گی

عورت

گلّہ بانوں کی خداوندی میں
خط و رُخسار پہ تعزیریں تھیں
کند تھا جذبۂ تحسینِ جمال
حُسن کے پاؤں میں زنجیریں تھیں

ہر زمیندار شہنشاہ کے پاس
کئی ناسُفتہ گُہر ہوتے تھے
محفلِ شب میں اُجالا بن کر
وقفِ اندوہ سحر ہوتے تھے

آگ اور بھاپ کے دوراہے پر
زیست لوہے کی طرح ڈھلنے لگی
جب ہوس کار نے سِکّے دکھلائے
ایک انجن کی طرح چلنے لگی
کسی اَن دیکھے ہوئے بازو پر
ریشمی جسم ڈھلک جاتا ہے
بادۂ شرم سے لبریز شباب
ایک ٹھوکر میں چھلک جاتا ہے

غزل

ہم جب صحنِ چمن میں آئے
سمٹ گئے پھولوں کے سائے

عشق کی جلتی دوپہروں میں
کُندن سے چہرے سنولائے

کب ٹوٹے گا سلسلۂ شب
چاند کئی چمکے ، گہنائے

دیکھ مآلِ جشنِ محبت
سیج لُٹی ، گجرے مرجھائے

ایک جمودِ غم تھے اکثر
چڑھتے سورج ، ڈھلتے سائے

ہم بھی چراغِ بزم تھے لیکن
روشن ہوتے ہی کجلائے

دامن دامن سلگ رہا ہے
رُت بدلی ، جوبن گدرائے

اِمشب اُن کا فقرہ فقرہ
دیر کی دُکھتی رگ سہلائے

دیکھ ظہیر وہ جلوۂ نَورس
اپنی تجلّی سے شرمائے

تقدیر

سنگ و آہن کی یہ دیوار ، یہ اونچی دیوار
دم بدم طارق و ناہید سے ٹکراتی ہے
اس کی پُرہول جسامت کی حقیقت معلوم !
دور تاحدِّ نظر دور — چلی جاتی ہے

اِس کے اُس پار — خداؤں کی حسیں وادی ہے
جس کے باغوں میں زمرد کے جلوخانے ہیں
دَف بجاتی ہیں لچکتی ہوئی دوشیزائیں
مرمر و خواب میں ڈھلتے ہوئے افسانے ہیں
اور خدا ؟— اُونگھتے رہتے ہیں گھنے سایوں میں
شغل اُن کا کہیں نغمے کہیں پیمانے ہیں

نگۂ وقت نے دیکھا نہیں اس وادی کو
ابر پاروں میں ستاروں میں نہاں رہتی ہے
نُور کے دائیرے بُنتی ہوئی اپنے پس و پیش
سحر آثار خلاؤں میں رواں رہتی ہے

ابنِ آدم کو پہنچنا ہے اسی وادی میں
ہاں مگر راہ میں حائل ہے یہ اونچی دیوار
مقصدِ زیست کے تیشے ہیں اگر زنگ آلود
سنگ و آہن کی یہ دیوار نہ ہوگی مسمار

یادِ ایام — سمن پوش قبیلوں کے جواں
سیل بن بن کے بڑھے برف کے طوفانوں میں
کٹ گئی جوشِ تہوّر سے یہ اونچی دیوار
مچ گیا شور خداؤں کے شبستانوں میں

قوتِ کشمکشِ زیست فراہم کرلیں
سینۂ نوعِ بشر قابلِ شمشیر نہیں
منہدم ہو کے رہے گی یہ پرانی دیوار
کون کہتا ہے کہ یہ قابلِ تسخیر نہیں

اِس کے اُس پار — خداؤں کی حسیں وادی ہے
جس کے باغوں میں زمرد کے جلو خانے ہیں
دف بجاتی ہیں لچکتی ہوئی دوشیزائیں
مرمر و خواب میں ڈھلتے ہوئے افسانے ہیں
اور خدا؟ — اونگھتے رہتے ہیں گھنے سایوں میں
شغل ان کا کہیں نغمے کہیں پیمانے ہیں

غزل

عزیز کس قدر مجھے نظارۂ بہار تھا
مگر نگاہ سے پرے کنارۂ بہار تھا

میری شبوں میں نکہتِ لطیف سی رچی رہی
تمہارا ہر نفس مجھے شمارۂ بہار تھا

کئی خزاں نصیب ، گلستاں میں جل کے رہ گئے
جمال ، پھول پھول کا شرارۂ بہار تھا

یہ تم نہ تھے ، چمن میں رُخ کی روشنی لئے ہوئے
فضائے لاجورد میں ستارۂ بہار تھا

تمہارا غم تو بن گیا ۔ فروغِ رنگِ زندگی
گلہ نہیں شباب اگر طرارۂ بہار تھا

اگر تلاشِ حُسنِ گل ہے آؤ ۔ شوق نے کہا
مگر جو چوٹ سہ سکو ۔ اشارۂ بہار تھا

ظہیر سرخ سرخ پھول شعلہ ہائے خس میں تھے
نشیمنوں کی آگ میں نظارۂ بہار تھا

بین الاقوامیت

دور اُدھر — جب میرے اجداد نے تقسیم کیا
رنگ اور نسل کی بنیاد پہ انسانوں کو
پرچمِ امن اتارے گئے تحقیر کے ساتھ
جنگ کی گونج نے تھرّا دیا ویرانوں کو

تیغ بردار ، جگردار ، جواں آتے تھے
اور وہ ان کے رجز — «ہم ہیں قبیلے کے امیر
وہ قبیلہ کہ پہاڑوں کو دھنک کر رکھ دے
وہ قبیلہ کہ تہوّر میں نہیں جس کی نظیر
وہ قبیلہ کہ بگولوں پہ کمندیں ڈالے
وہ قبیلہ کہ شہیدوں کا لہو جس کا خمیر
کون اس آہنی دیوار سے ٹکرائے گا
پنجۂ موت میں لے آئی ہے کس کو تقدیر؟ —»

اِسی انداز سے بہتا رہا انساں کا لہو
اِسی انداز سے ہر ملک میں چمکی شمشیر

صبح ہوتی ہے تو سورج کی طلائی کرنیں
مشرقی کوہ پہ سمٹی ہوئی تھراتی ہیں
دن چڑھے تک یہی سمٹی سی طلائی کرنیں
بحر و بر حلقۂ انوار میں لے آتی ہیں

تابشِ زیست قبیلوں سے نکل کر پھیلی
جا ملی پیکن و پیرو کے سمن زاروں سے
نُور کی موج کسی طور نہیں بٹ سکتی
رنگ اور نسل کی گرتی ہوئی دیواروں سے

تاج ، اہرام ، ابوالہول ، معلّق باغات
ایک مضبوط تسلسل کا پتہ دیتے ہیں

غزل

آندھیاں اٹھیں فضائیں دور تک کجلا گئیں
اتفاقاً — دو چراغوں کی لویں ٹکرا گئیں

آہ یہ مہکی ہوئی شامیں، یہ لوگوں کے ہجوم
دل کو کچھ بیتی ہوئی تنہائیاں یاد آگئیں

اس فضا میں سرسراتی ہیں ہزاروں بجلیاں
اس فضا میں کیسی کیسی صورتیں سنولا گئیں

اے خزاں والو! خزاں والو!! - کوئی سوچو علاج
یہ بہاریں پاؤں میں زنجیر سی پہنا گئیں

پھر کسی نے چھیڑ دی عذرِ جفا کی داستاں
دل پہ جیسے بھیگی بھیگی بدلیاں سی چھا گئیں

قانون

(۱)

مسندِ عدل پہ ھیں ظلِ الٰہ
اور پابوس غلاموں کے گروہ

یک بیک ۔ طوق و سلاسل میں اسیر
اک گرانڈیل جواں آتا ھے
کانپتے ھونٹ ، قدم لغزیدہ
ھیبتِ شاہ سے تھراتا ھے

یہ وہ مجرم ھے کہ جس نے سرِ راہ
ایک عورت کا اڑایا تھا مذاق

شاہ بولا :۔ «اسے اندھا کردو
اس کی نیّت میں فتور آیا ھے
راہ چلتے ھوئے عورت سے مذاق
اس نے اخلاق کو ٹھکرایا ھے»

دو سلاخوں کی بروئے فرمان
نورِ دیدہ سے بجھائی گئی پیاس

(۲)

حاجبو ! پاسِ ادب ظلِ الٰہ
خلوتِ شب کی طرف آتے ھیں

شاہ کے ساتھ حسینوں کا جلوس
چنگ و مردنگ لئے آتا ھے
کہیں پازیب چھنک جاتی ھے
کہیں نغمہ کوئی لہراتا ھے

آفتابے میں لئے تازہ شراب
شاہ گرتا ھے سنبھل جاتا ھے

جم گئی بزم — کُھلے بندِ قبا
رخ و شانہ سے نقاب اٹھنے لگے
باتوں باتوں میں تنفس ھوئے تیز
آنکھوں آنکھوں میں حجاب اٹھنے لگے

سر کسی سینۂ نورس پہ دھرے
شاہ کی رات گزر جاتی ھے

غزل

قدم قدم پہ جنوں اختیار کرتے تھے
شباب تھا تو ستارے شکار کرتے تھے

خود اپنی شرم میں دل ڈوب ڈوب جاتا تھا
اگر کبھی گلۂ حُسنِ یار کرتے تھے

کبھی سوادِ چمن میں سکوں تلاش کیا
کبھی شکایتِ حُسنِ بہار کرتے تھے

چراغ ٹوٹ گئے ، ڈوبنے لگے تارے
بجھے ہوئے تھے مگر انتظار کرتے تھے

حضورِ یار سے جب اذنِ گفتگو ملتا
جھکی نظر کی زباں سے پکار کرتے تھے

بایں کمال — کہ دامن سلگ سلگ اٹھا
طوافِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے تھے

اگرچہ عہدِ وفا معتبر نہ تھا — لیکن
بپاسِ خاطرِ دل اعتبار کرتے تھے

خوشا وہ لمحۂ نصرت ، کہ پیشِ دوست ظہیر
دل و نظر کی شکستیں شمار کرتے تھے

ادب برائے ادب

وادیٔ موت کا منظر بھی عجب منظر ھے
جھیل کے پاس — محلات نظر آتے ھیں
آبنوس اور صنوبر کے گرانبار محل !!
جن کے مینار دھندلکوں میں ڈھلے جاتے ھیں

عہدِ ماضی کے پُر اسرار لبادے پہنے
ان محلات میں پنہاں ھیں کئی شعبدہ باز
سحر کے زور سے تخلیق کیا کرتے ھیں
کہیں عذرائے تخیل کہیں لیلائے مجاز

العجب ! شعبدہ بازوں کے طلسمی نغمات
پھیل جاتی ھے دھندلکوں میں بھیانک آواز
خواھشِ مرگ چٹانوں پہ ابھر آتی ھے
غار در غار سرک جاتے ھیں تخریب کے راز

شعبدہ باز تمنائیں کیا کرتے ہیں
کہ اسی سرد اندھیرے میں گزر جائے حیات
تا ابد، ایک جمود، ایک سکوں، طاری ہے
ہونے پائے نہ کوئی گردشِ ایام کی بات

دُور اُفق پر - کسی بستی کے چراغوں کی قطار
روشنی اور حرارت کی خبر دیتی ہے
وہ مسافر جنہیں ملتا نہیں منزل کا سراغ
ان کو منزل پہ پہنچنے کی نظر دیتی ہے

غزل

جوانی کو سپردِ سوزِ دوراں کر رہا ہوں میں
باندازِ دگر جینے کا ساماں کر رہا ہوں میں

یہ میرے خون کے آنسو نہیں صحنِ گلستاں میں
ہجومِ گل میں کچھ شمعیں فروزاں کر رہا ہوں میں

حضورِ شمع کچھ بیتاب پروانوں کو دیکھا تھا
ابھی تک چاک چاک اپنا گریباں کر رہا ہوں میں

مجھے اپنے غموں پر مسکرانے کا سلیقہ ہے
نگاہِ لطفِ جاناں تجھ پہ احساں کر رہا ہوں میں

ابھی تو سینکڑوں بیکار سجدوں کی ضرورت ہے
ابھی تو امتحانِ کفر و ایماں کر رہا ہوں میں

یہیں سے اہلِ دل میں روشنی تقسیم ہوتی ہے
سرِ مژگاں — بہر عنواں — چراغاں کر رہا ہوں میں

ستارے مٹتے جاتے ہیں تبسّم بڑھتا جاتا ہے
سحر تک اعتبارِ دردِ ہجراں کر رہا ہوں میں

مجھے تو اے ظہیر، اک جشنِ ویرانی ہی راس آیا
بہر انداز اپنے گھر کو ویراں کر رہا ہوں میں

فطرت اور انسان

(۱)

رقص کرو شب تاب ستارو ! رقص کرو !!
چھنک چھنک — پاؤں کی چھاگل چھنکاؤ !
اُونگھ رہی ھے شب کی طلائی شہزادی
چاند کے ایوانوں میں نغمے پھیلاؤ

رقص کرو شب تاب ستارو ! رقص کرو !!
چھنک چھنک — پاؤں کی چھاگل چھنکاؤ !

حُسن تمہارا چشمِ فلک کا نُور سہی
میرا ذوقِ عشق تمہیں معلوم نہیں
فطرت کا ہر جلوۂ رنگیں میرے لئے
جلوۂ پارہ پارہ ھے منظوم نہیں

فطرت کے اِن میناکار خلاؤں کو
میرے ذوق کے سانچوں میں ڈھلنا ہوگا
حُسنِ ازل سے حُسنِ مکمل بننے کو
میرے ذہن کی راہوں پر چلنا ہوگا

رقص کرو شب تاب ستارو ! رقص کرو !!
چھنک چھنک ــــ پاؤں کی چھاگل چھنکاؤ !

(۲)

جاگو آتش ناک پہاڑو ! جوش دکھاؤ !!
شہروں پر سنگاب ــــ دمادم برساؤ
سرد ہوا جاتا ہے سوادِ پومپی آئی
اگلی ہیبت ناک روایت دھراؤ

جاگو آتش ناک پہاڑو ! جوش دکھاؤ !!
شہروں پر سنگاب ــــ دمادم برساؤ

آج تمہارے سنگ و شرر منظور مگر
کل اک لمسِ کاہ مجھے منظور نہیں
برف بنا کر رکھ دوں گرم چٹانوں کو
یہ ہنگامِ عزم بھی مجھ سے دور نہیں

میں نے جب بھی کھنک کھنک تیشے کھنکائے
دور افتادہ ٹیلوں پر نغمے لہرائے
میں نے جب بھی جدت کے جوہر دکھلائے
شور زمیں پر خوشبوؤں نے جال بچھائے

جاگو آتش ناک پہاڑو ! جوش دکھاؤ !!
شہروں پر سنگاب ــــ دمادم برساؤ

غزل

وہ حُسن اگر حُسنِ دلآرام نہیں ہے
آشفتہ سروں پر کوئی الزام نہیں ہے

کس مرحلۂ سود و زیاں سے نہیں گزرا
یہ دل ، جسے اندیشۂ آلام نہیں ہے

ہر آن اک نیم شبی کا سا تاثر
اس عشق میں کوئی سحر و شام نہیں ہے

وہ جلوۂ محتاط ، وہ محبوبِ کم آمیز
نزدیکِ رگِ جاں ہے ، سرِبام نہیں ہے

گلشن میں کسی شے کے چٹخنے کی صدا تھی
پیمانۂ گُل بھی تو مرا جام نہیں ہے

بڑھتا ہی گیا سلسلۂ دُوریٔ جذبات
اک عمر ہوئی نامۂ و پیغام نہیں ہے

پس منظرِ گلشن بھی میرے پیشِ نظر ہے
اک رقصِ بہاراں ہی مرا کام نہیں ہے

وحشی کا گریباں تو ظہیرؔ آج بھی ہے چاک
اور ان کی قبا موردِ الزام نہیں ہے

مجنوں کمندِ طرۂ لیلیٰ کند خیال
بر روئے دشت جلوۂ موجِ سراب را

آدمی ، آدمی کا دشمن ہے

ہر قدم پر ہزار مدفن ہے
آدمی — آدمی کا دشمن ہے

چند کانٹوں کو چن کے بیٹھ گئی
زندگی سخت تنگ دامن ہے

موڑ دشوار ، راستے مخدوش
راہبر بھی شریکِ راہزن ہے

بجلیاں پالتی ہے دامن میں
شاخِ گل بھی تو اپنی دشمن ہے

موت کا ناچ ، ناچتے ہیں رند
خون برستا ہے ، سرخ ساون ہے

چشمکیں چشمکیں — غبار غبار
کہیں بجلی کہیں نشیمن ہے

آنسوؤں کے دمک رہے ہیں چراغ
گھر ہمارا کبھی سے روشن ہے

بے سبب ڈھونڈتے ہو بوئے حیات
یہ چمن قاتلوں کا مسکن ہے

غزل

ہم اپنی تخریب کر رہے ہیں ہماری وحشت کا کیا ٹھکانہ
فضا میں بجلی نہ ہو تو خود ہی اجاڑ دیتے ہیں آشیانہ

غمِ محبت تلاش کرنے چلے تھے لیکن یہ کیفیت ہے
جھکی جھکی مضمحل نظر سے جھلک رہا ہے غمِ زمانہ

سحر ہو یا آمدِ سحر ہو میری خلش مٹ سکے تو جانوں
میرے لبوں پہ لرز رہا ہے ابھی وہی نالۂ شبانہ

خبر نہ تھی صحنِ گلستاں میں یہ حال ہوگا کلی کلی کا
گلوں نے گلچیں سے بھول کر بات کی باندازِ محرمانہ

اگرچہ حُسنِ قدیم اپنے پرانے تیور بدل چکا ہے
مگر وہی دل گرفتگی ہے — مگر وہی عشق کا فسانہ

آزادی

مُہرِ آزادی سے داغو میری پیشانی کو
میں وہ رہوارِ گرفتار ہوں صدیوں ہی جسے
بند رکھا گیا سنگینئ ماحول میں بے آب و گیاہ

مُہرِ آزادی سے داغو کہ تمہارے احباب
میری پیشانئ بریاں سے یہ اندازہ کریں
اس کو نوزاد خداؤں کی غلامی کا شرف حاصل ہے

اس سے پہلے بھی تمہارے اجداد
بہرِ تسخیرِ بلاد
مجھ کو ہر عرصۂ پیکار میں دوڑاتے رہے
اور میں ان کی ہوسناکئ اورنگ و حکومت کے لئے
شرق اور غرب کو ٹاپوں سے کچل دیتا رہا

آج بھی ہوں میں وہی اسپِ اصیل
میری باگیں کسی آمر کے حوالے کردو

جو مجھے اپنے زر و سیم کے انبار بڑھانے کے لئے
جھونک دے آتش و فولاد کے کھولاؤ میں

ھاں مگر — تم کو سناتا ھوں میں اک راز کی بات
میرے ھم جنس بیک رنگئ احساس ھوئے ھیں بیدار
وہ سلگتے ھوئے ماتھوں سے گرانے لگے، —
سرتابئ محکم کے شرار
اب کسی راکبِ آمر کی عبا رہ نہ سکے گی محفوظ

غزل

کیا خوب تھے آزادیٔ گلشن کے نظارے
ہر گل پہ بڑھے صورت زنجیر شرارے

دلچسپ رہا ، عشرتِ نَو روز کا ہنگام
وحشت بھی ہماری تو گریباں بھی ہمارے

ہوتی رہی ہر چشمِ تماشا کو گوارا
بے پردگیٔ حُسن سرِ راہ گزارے

کچھ ہم بھی سناتے غمِ جاناں کی حکایت
تھے مُہر بلب ، تلخیٔ ایام کے مارے

گہنائے گئے کتنے ہی تابندہ مہ و مہر
توڑے گئے کتنے ہی درخشندہ ستارے

پیرانِ حرم کا یہ تقاضا کہ ہو قائم
تقدیسِ حرم ، دشنہ و خنجر کے سہارے

ہر دیر کہ تھا قتل گۂ اہلِ تمنا
خون رنگ رہا ، سرخیٔ حالات کے مارے

دیکھا تو نہ منزل تھی ، نہ منزل کا نشاں تھا
کیا کیا نہ بھرم دیتے تھے ، رہبر کے اشارے

خوابِ سحر

یہ سحر کا خواب ہے سحر نہیں

اک فریب ہے سحر کا بانکپن
تیرگی ہی تیرگی ہے خیمہ زن
ابتلائے شب میں ہے ابھی وطن
ابھی اُفق سے مہر جلوہ گر نہیں

یہ سحر کا خواب ہے سحر نہیں

ہر روش لہو سے لالہ زار ہے
ہر کلی سموم کا شکار ہے
یہ بہار دشمنِ بہار ہے
مائلِ نمو کوئی شجر نہیں

یہ سحر کا خواب ہے سحر نہیں

شاعرِ طرب شہیدِ غم ہوا
فن پرست راہیٔ عدم ہوا

داستان سرا کا سر قلم ہوا
کوئی ترجمانِ فکر تر نہیں

یہ سحر کا خواب ہے سحر نہیں

گل عذار ، جنس کار بن گئے
پھول ، نَو رَسی میں ہار بن گئے
بوالہوس چمن شکار بن گئے
عاشقی میں عفّتِ نظر نہیں

یہ سحر کا خواب ہے سحر نہیں

کشت کار ، نخلِ بے مراد ہیں
بندگانِ مُزد ، بے سواد ہیں
خاص و عام کشتۂ فتاد ہیں
کلغئ امیر کو خبر نہیں

یہ سحر کا خواب ہے سحر نہیں

غزل

کشتۂ جورِ بہاراں نہیں دیکھے جاتے
ہم سے یہ چاک گریباں نہیں دیکھے جاتے

ہائے وہ لوگ کہ خود گھر کر جلا دیتے تھے
آج وہ سوختہ ساماں نہیں دیکھے جاتے

جاں سُلگتی ہے، کہیں دل سے دھواں اٹھتا ہے
منظرِ شامِ غریباں نہیں دیکھے جاتے

کون دیکھے گا یہ در پردہ سلگتے ہوئے دل
اب چراغِ تۂ داماں نہیں دیکھے جاتے

کس طرح عشق کی توہین گوارا کرلیں
حُسن کے بال پریشاں نہیں دیکھے جاتے

جب سے خاموش چراغِ دلِ برباد ہوا
شہر کے جشنِ چراغاں نہیں دیکھے جاتے

کوئی جگنو یا ستارہ تری قسمت میں نہیں
غم ترے اے شبِ ہجراں نہیں دیکھے جاتے

آج احساسِ بشر نرم و سبک تر ہے ظہیر
آج یہ وحشی و زنداں نہیں دیکھے جاتے

فرد اور ریاست

یہ ہے ایوانِ حکومت — میری تخئیل کا عکس
اس کے موسائی ستوں میں نے کئے ہیں تعمیر
چیر کر تیشۂ تدبیر سے سنگِ سیما
میں نے کھینچی ہے ، تمدن کی یہ اُجلی تصویر

یہ رصد گاہ کے گنبد ، یہ طرب گاہ کے طاق
میرے خاموش ارادوں کی مقفٰی تقریر
یہ حواشی ، یہ سفالے ، یہ جھروکے ، یہ چراغ
میرے ھاتھوں سے معین ہوئی سب کی تقدیر

میں نے ڈھالے ھیں گرانڈیل پلوں کے ڈھانچے
وسعتِ آب کو مغلوب کیا ھے میں نے
میں نے پھیلائی ھے سبزے کی حریری چادر
خطۂ شور کو مرطوب کیا ھے میں نے

یہ اساطیرِ تمدن ، یہ مشاھیر ، یہ تاج
چند کمیاب نمونے میری صنّاعی کے
یہ نوادر کے ذخیرے ، یہ کتابیں ، یہ فنون
چند مظہر ، میری محنت ، میری جانکاھی کے

مجھ کو محنت کے عوض تحفۂ تعزیر ملا
میرے ہر لفظ پہ قانون کی زنجیریں ہیں
میرے جذبات کہ تھے شعلۂ مثبت کی طرح
اب انہیں گھر میں دھندلانے کی تدبیریں ہیں

کل سمجھتے تھے مجھے محورِ ہنگامۂ دہر
آج میں ہوں کہ بتِ سنگ کی مانند خموش
میرا ہر زاویۂ جسم حرارت سے تہی
میری صورت میں نہیں شائبۂ رنگِ خروش

میں وہ مایوس مصور ہوں کہ جس کا شہ کار
اپنے خالق کی تباہی پہ تبّسم فرمائے
میں وہ ہوں شمع جو اوروں کو دکھا کر منزل
آپ خود حلقۂ ظلمات میں ڈھل کر رہ جائے

اجنبی دوست ، میرے دوست ، عنایت لیکن
اپنی آنکھیں نہ جھکا جذبۂ توقیر کے ساتھ
میں تو ہوں دھوپ میں سنولائی ہوئی لاش جسے
راہرو دیکھتے ہوں خندۂ تحقیر کے ساتھ

منتظر ہوں ، میرے خطِ جبیں سے اُبھرے
عظمتِ آدم و تقدیسِ بشر کا خورشید
یک بیک — نُور سے معمور ہو ذرہ ذرہ
یک بیک ہونے لگے عہد نوی کی تمہید

غزل

پیشِ نظر ہے دفترِ امکاں کھلا ہوا
یعنی ثبوتِ عظمتِ انساں کھلا ہوا

دار و رسن تعلقِ خاطر کی بات ہے
ورنہ قریب تر تھا شبستاں کھلا ہوا

جس دن سے شورِ آمدِ فصلِ بہار ہے
اس دن سے ہے یہاں درِ زنداں کھلا ہوا

ابلیس اب بھی سیم و سمن سے ہے بہرہ ور
اب بھی ہے بابِ رحمتِ یزداں کھلا ہوا

اب تو مجالِ آبلہ پائی کی بات ہے
ہے جادۂ دیارِ حبیباں کھلا ہوا

مت پوچھ زخمِ سینۂ اہلِ وطن کا حال
جس طرح بے وطن کا گریباں کھلا ہوا

آنکھوں میں آبروئے جنوں کی حکایتیں
سینہ مثالِ گنجِ شہیداں کھلا ہوا

کس کو ظہیر ظلمتِ شب سے اماں ملی
دیکھا ہے کس نے مطلعِ تاباں کھلا ہوا

غزل

موسم بدلا ، رُت گدرائی ، اھلِ جنوں بے باک ھوئے
فصلِ بہار کے آتے آتے ، کتنے گریباں چاک ھوئے

گل بوٹوں کے رنگ اور نقشے ، اب تو یونہی مٹ جائیں گے
ھم کہ فروغِ صبح چمن تھے ، پابندِ فتراک ھوئے

مہرِ تغیّر اس دھج سے آفاق کے ماتھے پر چمکا !
صدیوں کے افتادہ ذرے ھم دوشِ افلاک ھوئے

دل کے غم نے دردِ جہاں سے مل کے بڑا بے چین کیا
پہلے پلکیں پُرنم تھیں ، اب عارض بھی نمناک ھوئے

کتنے الھڑ سپنے تھے جو دورِ سحر میں ٹوٹ گئے
کتنے ھنس مکھ چہرے ، فصلِ بہاراں میں غمناک ھوئے

برقِ زمانہ دُور تھی لیکن مشعلِ خانہ دُور نہ تھی
ھم تو ظہیر ، اپنے ھی گھر کی آگ میں جل کر خاک ھوئے

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بہ خونِ دل
قانونِ باغبانئی صحرا نوشتہ ایم

غزل

کس کو ملی تسکینِ ساحل، کس نے سر منجدھار کیا
اس طوفاں سے گزرے جس نے نـدی نـدی کو پار کیا

اے فرزانو! دیوانوں کے جذبۂ دل کی قدر کرو
ان کی ایک نظر نے آتش آتش کو گلزار کیا

رنجِ محبت، رنجِ زمانہ، دونوں ہم سے خائف ہیں
ہم نے سوچ سمجھ کر دل کو سرگرمِ پیکار کیا

صحرا صحرا ہم نے نوک خار سے تلوے سہلائے
محفل محفل ہم نے اپنی وحشت کا اقرار کیا

ان سے کہہ دو سامنے آکر اپنے جلوے عام کریں
خلوتِ ناز میں چھپ نہ سکیں گے ہم نے اگر اصرار کیا

ہم نے اپنے عشق کی خاطر، زنجیریں بھی دیکھی ہیں
ہم نے ان کے حُسن کی خاطر، رقص بھی زیرِ دار کیا

بستی بستی آج ہماری سعئ وفا کی شہرت ہے
ہم نے ظہیر اک عالم کو، پابندِ نگاہِ یار کیا

زندگی

کرنوں کی جوالا پھوٹی
چھوٹی سورج کی مہتابی سرخ چناروں میں
پھولوں کے طغرے مہکے
بھکے شوخ انداز پرندے کھلی بہاروں میں
فطرت نے ساز بکھیرے
چھیڑے نئے سنہری نغمے سبزہ زاروں میں

ظلمت کے بعد اجالا
جالا نور کا بُنتا ہے ، افلاک کی چھاؤں میں
اے حُسنِ نگارِ عالم !
پیہم ایک تنوع ہے موجود خلاؤں میں
پھیلا ہے رقص ـــ افق تک
چھمک چھمک ہے اجرام و اصنام کے پاؤں میں

کیا شے ہے درونِ خلوت؟
جلوت جلوت جوشِ جنوں ہے سب دیوانوں میں

یہ جلتے، سلگتے، نقشے
شعلے، شعلے، صدیوں کے مربوط افسانوں میں

ساحل؟ ۔ تحصیلِ حاصل
منزل موجودات کی ہے مضمر طوفانوں میں

اک موجۂ بوئے گریزاں
گرداں گرداں ارض و سما کی تنگ بہاروں میں

اک شاخِ نمو ۔ ژولیدہ
غلطیدہ گلزاروں کے محدود نظاروں میں

اک چشمکِ مہر بداماں
تاباں تاباں، لحظہ لحظہ، شبنم زاروں میں

غزل

اب صاحبِ دوراں آتے ھیں ، اب فاتحِ میداں آتے ھیں
وہ شیر تو شیرِ قالیں تھے اب شیرِ نیستاں آتے ھیں

جو تُند بگولوں سے الجھے ، وہ عزمِ سفر کی بات کرے
اس منزل نَو کے رستے میں ، کتنے ھی بیاباں آتے ھیں

آھنگِ تفنگ و تیر میں ھم گاتے ھیں سرودِ آزادی
ھنگامۂ دار وگیر میں ھم ، سر مست و غزل خواں آتے ھیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے، کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ھیں

ھم ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ھیں
اس بزم میں خنجر در دامن جتنے بھی مسلماں آتے ھیں

پھولوں پہ مسرت ناچے گی کلیوں پہ اجالا برسے گا
ھم لوگ برنگِ نورِ سحر ، اے صبح گلستاں آتے ھیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ھے
اس دھج سے مل کر چہروں پر ھم خونِ شہیداں آتے ھیں

ستارہ شناس

کہکشاں ، جس کے طلا رنگ ، تنک تاب خطوط
شب بہ شب ، وسعتِ بے نور کو چمکاتے رہے
ٹوٹ کر — شعلوں کی مانند — بکھر جائیں گے
سینۂ کوہ سے پھوٹے گا دھکتا لاوا
دُور — تاحدِ نظر پھیلا ہوا خطۂ خاک
زلزلاتا ہوا پاتال میں دھنس جائے گا

روشِ سبز پہ رخسارۂ لالہ کا لہو
نئے طغروں ، نئی سیجوں کی بشارت دے گا
ختم ہوجائے گی — بے رونقیِ رنگِ خزاں

حلقۂ برق سے ٹکرائی ہوئی ہر تتلی
بے خطر — کرۂ افلاک میں پراں پراں
کئی اَن دیکھے ستاروں سے گزر جائے گی

گوشۂ شرق سے اٹھیں گے پرانے پردے
نیا سورج — نئے انساں کو سلامی دے گا
نیا انساں — جو اڑائے گا خداؤں کا مذاق

غزل

یہ کاروبارِ چمن اس نے جب سنبھالا ہے
فضا میں لالہ و گل کا لہو اچھالا ہے

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

ہجومِ گل میں چہکتے ہوئے سمن پوشو !
زمینِ صحنِ چمن آج بھی جوالا ہے

ہمارے عشق سے دردِ جہاں عبارت ہے
ہمارا عشق ہوس سے بلند و بالا ہے

سنا ہے آج کے دن زندگی شہید ہوئی
اسی خوشی میں تو ہر سِمت دیپ مالا ہے

ظہیر ہم کو یہ عہدِ بہار ، راس نہیں
ہر ایک پھول کے سینے پہ ایک چھالا ہے

پیامبر

گھرے سایوں کے مرغولے پھیل چکے ہیں
تُند ہوائیں بال بکھیرے چیخ رہی ہیں
بجلی کی پھنکار سے ٹیلے کانپ رہے ہیں
آڑے ترچھے پیڑ جڑوں سے ٹوٹ رہے ہیں
ذرّے ذرّے نے ترشول اٹھایا ہؤا ہے
منظر پر وحشت کا عالم چھایا ہؤا ہے

ایک پیمبر قُلّۂ کوہ پہ استادہ ہے
بازو تولے ، طوفانوں سے اُلجھ رہا ہے
اس کی جبیں پر گردِ حوادث جمی ہوئی ہے
اس کی عبا کے ٹکڑے صرصر میں اڑتے ہیں
اس کے سر پر لاکھوں پتھر ٹوٹ چکے ہیں
اس کا بدن کتنے ہی صدمے جھیل چکا ہے

اس کے ارادے روزِ ازل سے پائندہ ہیں
اس کی چوٹ ، چٹانوں کو دہلا دیتی ہے

اس کا بُشرہ ، جہدِ مسلسل کا مظہر ہے
اس کے ہر انداز سے عظمت ٹپک رہی ہے
اس کے عمل سے زیست کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں
اس نے موت کی پہنائی کو پاٹ لیا ہے

تُند ہوا ، طوفان ، اندھیرا — کچھ نہ رہے گا
اس کی کاوش ، منظرِ نَو تعمیر کرے گی
میدانوں پر نرم اجالے برسائے گی
وقت کے اڑتے سایوں کو نخچیر کرے گی

☆

تین شعر

کہاں احساسِ غربت میں کمی معلوم ہوتی ہے
وطن کی سر زمیں بھی اجنبی معلوم ہوتی ہے

بہر وعدہ تمنا اور بہر جلوہ تلاطم ہے
محبت اعتبارِ زندگی معلوم ہوتی ہے

متاعِ ہر دو عالم کی حقیقت کُھل گئی شاید
تہی دستی ، جنوں کی مفلسی معلوم ہوتی ہے

غزل

جو پست ہیں تو بلندی سے ہم کنار بھی ہیں
زمیں نشیں ہی نہیں آسماں شکار بھی ہیں

ہمارے حال سے مایوس کیوں ہیں اہلِ چمن
خزاں زدہ ہیں تو پیغمبرِ بہار بھی ہیں

سنبھال دامنِ خوں رنگ ، مشقِ ناز نہ کر
بجھے دلوں میں ابھی ایک دو شرار بھی ہیں

ہماری خاک سے ڈالیں گے طرحِ عالمِ نو
فنا درست ، مگر جنسِ پائدار بھی ہیں

جنہیں سلام کرے گا نظامِ مستقبل
وہ آج جرمِ بغاوت میں زیرِ دار بھی ہیں

ہمارا عشق ہمیں تمکنت سکھاتا ہے
کشیدہ سر بھی ہیں ، پابندِ زلفِ یار بھی ہیں

ہمارے پاس اجالا بھی ہے ، شرارے بھی
کہ شمعِ بزم بھی ہیں ، تیغِ شعلہ دار بھی ہیں

ظہیر اپنا گریباں نہ دیکھ ، بزم کو دیکھ
یہاں کچھ اور گریبانِ تار تار بھی ہیں

نیا منشور

هم ہوں گے تو حالات کا یہ رنگ نہ ہوگا
بے مہر و محبت کوئی فرسنگ نہ ہوگا
ہم امن کے حامی ہیں قلمرو میں ہماری
دمامہ و تیغ و طبلِ جنگ نہ ہوگا

کب روئے سحر ہوتا ہے بے شبنم و تنویر ؟
جب اپنی سحر آئے گی یہ ڈھنگ نہ ہوگا
جس مہر کو ہم لائیں گے فردا کے افق پر
وہ مہر کسی طور بھی شبرنگ نہ ہوگا

اظہار کا اسلوب، تغزل ہو کہ نغمہ
فن کار کی ہستی کے لئے ننگ نہ ہوگا
مانی کو ہر اک قوس پہ تحسین ملے گی
رسوائے وطن خامۂ ارژنگ نہ ہوگا

فرهاد کے احساس کی توقیر بڑھے گی
شیریں کے عوض تیشۂ بے رنگ نہ ہوگا
ہم عشق کی توہین گوارا نہ کریں گے
مجنوں کی تواضع کے لئے سنگ نہ ہوگا

انبوہِ سرِ راہ کی تعظیم کریں گے
آمر کی جلالت پہ کوئی دنگ نہ ہوگا
اس بزم کی آواز پہ لبیک نہ ہوگی
جس بزم میں جمہور کا آہنگ نہ ہوگا

ہم جس کی ولادت کے پیامی ہیں وہ انساں
مغلوبِ جہانداریٔ ہوشنگ نہ ہوگا
جس دور کو ہم لائیں گے وہ دورِ مساوات
دریوزہ گرِ افسر و اورنگ نہ ہوگا

اے کشورِ سامانِ ہلاکت کے خداؤ!
مصروف رہو کاوشِ بربادیٔ جاں میں
جس جذبۂ تعمیر کی تخریب نہ ہوگی
وہ جذبۂ البرز شکن بھی ہے جہاں میں

غزل

محفل میں دل کا داغ نمایاں نہ کرسکے
تا صبح اک چراغ فروزاں نہ کرسکے

ساحل تو ایک سلسلۂ بے ثبات تھا
ہم آپ ہی تہیۂ طوفاں نہ کرسکے

منزل نظر پڑی تو بگولوں نے آلیا
وحشت ملی تو سیرِ بیاباں نہ کرسکے

دل ہر قدم پہ شعلۂ حرماں بنا رہا
ہم گھر کی روشنی سے چراغاں نہ کرسکے

جن کو تھا اِدعائے غمِ گل — وہی ظہیر
پھولوں کے ساتھ چاک گریباں نہ کرسکے

غزل

کُھل گیا یوں معاملہ دل کا
دے اٹھا لَو چراغ محفل کا

ہم کو طوفاں سے جب ملی فرصت
یاد آیا سلوک ساحل کا

سُن لیا نالۂ جرس ہم نے
اٹھ گیا اعتبار منزل کا

تھم نہ جائے کہیں ہوائے جنوں
پردہ اٹھنے لگا ہے محمل کا

ایک ہنگامۂ جنوں ہی تو تھا
کس قدر شور ہے سلاسل کا

ہم نے قاتل کی دھج بھی دیکھی ہے
آہ لیکن وہ رقص بسمل کا

انقلابِ چمن کے ساتھ ظہیر
لُٹ گیا قافلہ عنادل کا

غزل

کاہن ہو یا راہ نمُا ہو اب نہ کسی کی چال میں آؤ
ماضی مردہ ، حال اندھیرا ، مستقبل کی خیر مناؤ

بے آئینہ بے شانہ بھی ، اس کی سج دھج قائم ہے
زلفِ گیتی کی مت پوچھو ، ایک بگاڑ اور لاکھ بناؤ

میں تو گھائل ہو کر چپ تھا ۔ لوگ ہی سب کچھ جان گئے
خون کے دھبے بول رہے ہیں آؤ جھوٹی قسمیں کھاؤ

دار تو ہے اک حیلۂ جلوہ ، دار سے ہم نے دیکھا ہے
ستواں جسم ، گلابی چہرہ ، چال قیامت ، نرم سبھاؤ

میں بھی چپ ہوں ، دل بھی چپ ہے چاند ستارے بھی خاموش
ساری دنیا مہر بلب ہے جو کچھ بھی چاہو فرماؤ

تم بھی ظہیر اس دنیا میں اضدادِ جنوں پر زندہ ہو
قریہ قریہ ہنستے گزرو ، بستی بستی آگ لگاؤ

غزل

کبھی ھوا کا کبھی اپنا رُخ بدل کے چلو
یہ دور برق و شرر ھے سنبھل سنبھل کے چلو

غم حبیب کے سانچے بہت پرانے ھیں
غمِ حیات کے سانچوں میں آج ڈھل کے چلو

فضا تجلئ شب تاب کو ترستی ھے
چراغِ راہ بنو ، ھر قدم پہ جل کے چلو

زمانہ ھستئ ساحل کا اب نہیں قائل
مثالِ موجۂ طوفاں اچھل اچھل کے چلو

اسی میں حکمتِ آسائشِ جہاں ھے ظہیر
کہ خاک پھانک سکو اور خوں اگل کے چلو

غزل

جاؤ کہہ دو کوئی ساحل کے شبستانوں میں
لنگر انداز ہوں میں آج بھی طوفانوں میں

ہے کوئی شعلۂ سرکش جو ادھر سے گزرے
رقص جاری ہے بگولوں کا بیابانوں میں

اپنے خوش رنگ جھروکوں سے نہ کر چشمکِ ناز
چشمکیں آگ لگا دیتی ہیں کاشانوں میں

برق پر جلوۂ لالہ کا گماں ہو شاید
ورنہ کس دن سے بہار آئی گلستانوں میں

عشق کو دار پہ کھینچا تو کئی زہرہ جمال
اپنی تنہائی پہ روتے تھے شبستانوں میں

دیکھئے دستِ جنوں آج کہاں تک پہنچے
گرم ہے بحثِ گریباں تیرے دیوانوں میں

غزل

مزاجِ عشق عجب شان سے ہوا برہم
جہاں میں اڑنے لگا انقلاب کا پرچم

قبائے گل پہ لہو تھا ، صبا پریشاں تھی
بہار کرتی رہی ہے بہار کا ماتم

خوشا ! کہ نعرۂ جمہور ہو رہا ہے بلند
بڑی ہی دیر سے نبضِ حیات تھی مدھم

اب اہتمام سے تقریبِ نُور دیکھیں گے
طلوعِ صبح کی خاطر تو جی رہے تھے ہم

ہمارے نام سے خائف رہو خدا وندو !
ہمارا نام ہے ــــ اعلانِ عظمتِ آدم

ظہیر ــــ سایۂ گل میں سکوں تلاش نہ کر
بپا چمن میں ہوئی جنگِ شعلۂ و شبنم

غزل

گلُشن کی جگہ پھول کی حسرت نہ کریں گے
ہم تنگئ داماں کی شکایت نہ کریں گے

بن جائیں گے ہم صبح درخشاں کے پیامی
ہم قافلۂ شب کی قیادت نہ کریں گے

ہم جانتے ہیں رُتبۂ تسلیمِ شہیداں
مرجائیں گے قاتل سے شکایت نہ کریں گے

ہم کل بھی سرِ دار صداقت کے امیں تھے
ہم آج بھی انکارِ حقیقت نہ کریں گے

کرلیں گے یہیں فیصلۂ جیب و گریباں
یہ فیصلہ مرہونِ قیامت نہ کریں گے

جو شوخ زمانے کے لئے وجۂ ستم ہو
اس شوخ سے اظہارِ محبت نہ کریں گے

دستورِ سحر کیجئے منظور تو ہم لوگ
قانونِ شبستاں سے بغاوت نہ کریں گے

غزل

تیری آنکھوں میں سرِ بزم حیا دیکھی ھے
ھم نے مایوسئ اربابِ وفا دیکھی ھے

جب تیرے حُسنِ پُر آشوب پہ آیا ھے نِکھار
تیرے دیوانوں کی وحشت بھی سوا دیکھی ھے

کوئی زنجیر نہ رکھی ھو، پسِ پردۂ گُل
ھم نے گلُزار میں زِنداں کی ھوا دیکھی ھے

اشک شوئی کے لئے ھی کوئی آیا ھوتا!
اپنے آنسو تھے تو اپنی ھی قبا دیکھی ھے

عمر بھر اس دلِ وحشی سے رھی وابستہ
ایک اُمید کہ زنجیر بپا دیکھی ھے

غزل

صحرائے خیال جل رہا ہے
ہر سانس دھواں اگل رہا ہے

مشرق سے ابھر رہا ہے ساحل
طوفاں ہے کہ رُخ بدل رہا ہے

موسم میں وہ آنچ ہے کہ ہر گل
تانبے کی طرح پگھل رہا ہے

یہ رات، یہ بے کراں اندھیرے
اک دل کا چراغ جل رہا ہے

دِل اور تاثرِ شبِ غم
شیشے میں سکوت ڈھل رہا ہے

اے زلف گھنا درخت بن جا
گرمی میں تو دم نِکل رہا ہے

جلوہ ہے پرانی دھج پہ قائم
غم چولا نیا بدل رہا ہے

یاروں سے ظہیر یہ زمانہ
شطرنج کی چال چل رہا ہے

ایشیاء

نوعِ انساں جب اپنے اوائل میں تھی
تیرے بیٹے چراغِ تفکّر لئے
قافلوں کو — جنہیں ظلمتوں میں بھٹکنا پڑا
منزلوں کا اجالا دکھاتے رہے

ناتراشیدہ وقتوں میں جب اشتمالی قبیلوں کا دستور دھندلا گیا
جب سنہرے افق کا تصور بھی ذہنوں میں سنولا گیا
جب تمدن میں ٹھہراؤ سا آ گیا
اس گھڑی، تیرا زرتشت اندازِ نَو سے اٹھا
اس نے بہرِ بشر، سرقبیلی* حکومت کا فانوس روشن کیا
سر قبیلی حکومت کا فانوس، — جس سے حرارت بڑھی
بے بصر زیست کو روشنی مل گئی
اور تاریخ کی ایتھری موج رفتارِ نَو سے مچلنے لگی

خطۂ زرد پر خیلداروں نے جب، خون آلود جھنڈوں کو لہرا دیا
جب جیوشِ زرہ پوش نے تند نعروں سے میدانِ پیکار گرما دیا
جب زمیں زرد سے سرخ ہونے لگی

* Petriarchy

اس گھڑی ، کن فیوشش ، فرستادۂ امن ثابت ہوا
اس کا آدرش سنتے ہی مغرور سامنت دو زانو ہونے لگے
اس نے پتھریلے ذہنوں میں پھُولوں کی نرمی بھری
اس نے بوئے مؤدت سے ہر قریہ و شہر مہکا دیا
خطۂ زرد پر مہر و الفت کا سورج چمکنے لگا

ہند کی وادیوں میں ہر اک برھمن جب پروہت سے اوتار بننے لگا
جب برھما کی شکتی کے شعلوں میں ہر جسم جلنے لگا
جب انسان شودھر کے سانچے میں ڈھلنے لگا
اس گھڑی، تیرے گوتم نے، غاروں ، گپھاؤں میں نروان کا نور پھیلا دیا
اس نے شودھر کی انسانی عظمت کو چمکا دیا
اس کے بھکشو ہر اک دیش میں پا برھنہ پیامِ اخوت سناتے رہے
اس کے بھکشو بخارا میں لنکا میں مُکتی کے نغمات گاتے رہے
ہند کی وادیوں میں نئے پھول کھلنے لگے — پھر بہار آگئی

عہدِ اولی کی ہر داستانِ کہن تیری ممنون ہے
تیرے سینے سے آرٹ اور فن کے طرحدار چشمے ابلتے رہے
جس سے دنیا کی ہر نسل ، ہر قوم ، شاداب ہوتی رہی
تیرے بیٹے ، افق تا افق ، فلسفہ کے چراغوں کی لاٹیں اڑاتے رہے
تیرے بیٹے ، ضمیرِ بشر جگمگاتے رہے
تیرے بیٹوں نے تہذیب و کلچر کے لاکھوں طلائی ہیولے بُنے
ان ہیولوں کے ہالوں میں صدیوں تک انسان آرام کرتے رہے

وہ ہیولے — تیری عظمتِ پاستاں کے امیں

پھر یکایک تیرے کوہ و صحرا پہ آویزشوں کا اندھیرا امڈنے لگا
تیرے نیلے خلاؤں میں مہر و محبت کے روشن ستارے بھی کجلا گئے
تیرے بانکے خد و خال سنولا گئے
وقت کی کوکھ سے ایسے تیرہ تصوّر، تبردار پیدا ہوئے
جن کی تلوار کی کاٹ سے امن قتلہ بہ قتلہ بکھرنے لگا
جن کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پہنائیٔ بحر و بر تھرتھرانے لگی
جن کی یلغار سے عصمتوں، آنسوؤں اور آھوں کی تحقیر ھوتی رھی
جو تری لاجوردی جبیں پر ھزاروں برس تک کچوکے لگاتے رھے
وحشیوں کی طرح مسکراتے رھے

ارضِ ایران سے شاہ دارا اٹھا
اس کے خونخوار لشکر، مضافاتِ پنجاب و قندھار پر چھاگئے
اس کی تلوار، اس کی ھوس کے فسانے، لھو میں نہا کر سناتی رھی
اس کی نظروں کی گرمی سے کوہ و بیاباں پگھلتے رھے
اس کی ٹھوکر سے پاتال ھلتے رھے

اور اپالو کا بیٹا، سکندر یہی عزمِ تاریک لے کر اٹھا
ایک ھی جست میں وہ ھمالہ کی سیسہ پلائی چٹانوں سے ٹکرا گیا
اس نے جس سمت دیکھا وھاں ـ گردنوں اور جسموں کے مینار بنتے گئے
اس کے مفتوح ملکوں میں مرگِ مسلسل کے فرمان جاری رھے

آج بھی ٹیکسلا کی فصیلوں سے لپٹی ہوئی ہے وہ گردِ کہن
جس کو مقدونیہ کے جواں عرصۂ کشت و خوں میں اڑاتے رہے

پارتھی دیوزادوں نے شادابئ باختر کو لہو سے منقش کیا
وہ بگولوں کی صورت چمن در چمن ہر کفِ برگِ گل سے الجھتے رہے
وہ ہر اک وادئ سبز و شاداب سے آتشِ برق بن کر گزرتے رہے
سندھ کے ریگ زاروں میں بادِ سموم، ان کی بوئے تنفس سے پیدا ہوئی
جس کی آنچوں سے اب تک سوادِ مہنجو دھکتا رہا —

وہ گرانڈیل ہُن — جن کے نیزے مہ و مہر کو صید کرتے رہے
جو چناروں، بہاروں، ستاروں کی عفت پہ یلغار کرتے رہے
طورماں کی قیادت میں ہر وسعتِ سبز پر برق بن کر گرے
وہ جہاں بھی گئے خرمنوں کو جلاتے رہے
ہر نشیمن کو شعلے دکھاتے رہے
مالوہ کے کلہ دار سرباز بھی ان کے طوفاں کے آگے سنبھلتے ہوئے
مثلِ خاشاک جانے کدھر بہ گئے؟

یادِ ایّام — چنگیز و تیمور نے نَو بہ نَو قوتوں کو مسخّر کیا
خوارزم کا حسیں شہر فریاد و شیون کی دھندلاہٹوں میں لرزنے لگا
اس کے گلشن، محلات، عشرت کدے۔ قتل گاہوں میں تبدیل ہونے لگے
اس کا ماضی چراغِ سحر کی طرح ٹمٹمانے لگا
— تختِ دھلی کے پایوں سے پھانسی کے تختے تراشے گئے
جن پہ مظلوم بیٹوں، ستم خوردہ ماؤں کی لاشیں تڑپتی رہیں

جن پہ لاکھوں جوانوں کو بے جرم دم توڑ دینا پڑا
جن پہ دہشت کا عفریت — صبح و مسا رقص کرتا رہا

پُرتگالی جوانوں نے ہرمز ، ملا کا ، جزائر* پہ دھاوا کیا
ان کے جنگی جہاز ، آبناؤں ، خلیجوں پہ گھرے دھوئیں کے
پھریرے اڑاتے رہے
وہ سمندر کی موجوں پہ بزمِ مداد و شبینہ سجاتے رہے
وہ حریفوں سے دھانوں کی بالیں بزورِ حرب چھین لیتے رہے
وہ بزورِ حرب اجنبی وادیوں سے طرب چھین لیتے رہے

پھر فرانسیسی زردار سیم و طلا لوٹنے کی غرض سے بڑھے
وہ سویزی ممالک پہ تیغِ ستم آزماتے رہے
اپنی طاقت کا سکّہ جماتے رہے
کارومنڈل کے پتھریلے پھیلاؤ پر ان کی توپیں دما دم گرجتی رہیں
وہ مسولی پٹم کے محلوں میں تسخیرِ عالم کے نقشے بناتے رہے
نار منڈی کی وسکی لنڈھاتے رہے
لندنی تاجروں نے مشینوں کو دنیائے انسانیت پہ مسلط کیا
وہ بشر کی بزرگی کو چاندی کے سکوں میں تبدیل کرتے رہے
وہ شگفتہ جبینوں پہ ادبار کا خون ملتے رہے
— وہ عقابوں کی مانند ، ارضِ مقدس پہ چکر لگاتے رہے
وہ مضافاتِ باکو کے چشموں پہ قبضہ جماتے رہے

---

* مشرقی جزائر

وہ شیوخِ عرب کے عمامے گراتے رہے
وہ سراج اور ٹیپو کی عظمت کے خاکے اڑاتے رہے
وہ محبِ وطن چینیوں کو بنوکِ تبر آزماتے رہے
دیر تک سارے مشرق پہ ان شائی لاکوں کا قبضہ رہا

آخرِ کار تیرے لب و رخ سے گردِ غلامی اترنے لگی
آج پھر تیرے عہدِ کہن کے حسیں نقش ابھرنے لگے
آج پھر تیرے دامن دریدہ سپوتوں میں تحریکِ پندار پیدا ہوئی
آج پھر ان کا بجھتا شعور، عہدِ نَو کی شعاعوں سے شعلہ بنا
وہ عوامی محبت کے لہریلے پرچم کے سائے میں آنے لگے
وہ مساوات کے گیت گانے لگے
وہ پھٹی آستینوں، گرے آنسوؤں کو زمیں سے اٹھانے لگے
وہ خیالاتِ نَو کی حرارت سے جابر خداؤں کا دامن جلانے لگے

تیرے بیٹوں نے دستورِ جاگیر ٹھکرا دیا
تیرے بیٹوں نے عفریتِ سرمایہ داری کو سولی پہ لٹکا دیا
تیرے بیٹوں نے شاہنشہی لشکروں کو بضربِ قوی خون میں تڑپا دیا
تیرے بیٹوں نے پیکن سے بغداد تک، ذہنِ دہقان و مزدور گرما دیا

ان کے رنگِ عمل سے بشر کی جبیں کی دمک بڑھ گئی
ان کے رنگِ عمل سے شگوفے اگلتی زمیں کی لہک بڑھ گئی
ان کے رنگِ عمل سے عروسِ شبستاں کے رُخ کی چمک بڑھ گئی

وہ تجھے اور سارے جہاں کو قیودِ سلاسل سے آزاد کرنے لگے
وہ تجھے اور سارے جہاں کو نئے سر سے آباد کرنے لگے

آج یورال کی سبز پہنائیوں سے نیا آدمی کسمساتا اٹھا
اس کی دانش کی کرنوں نے اقصائے عالم کو تابندہ تر کردیا
وہ نئی زندگی کے طلسمی تصور کی مشعل جلانے لگا
وہ سرا پردۂ ارتقائے بشر کے پر اسرار پردے اٹھانے لگا
وہ نگارانِ فردا دکھانے لگا

اس نے پیغمبرانہ متانت سے، توپوں، بموں اور دھماکوں کی تحقیر کی
اس نے انساں کو انساں سے باہم ملانے کی تدبیر کی
اس کی نظروں کا مرکز کوئی منطقہ یا قبیلہ نہیں
وہ رموزِ بہار و خزاں جاننے کی تمنا میں بے تاب ہے
اَن گنت آفتابوں، کئی ماہتابوں کی تسخیر اس کے مقدّر میں ہے

آج تاتار و جیہول کی سرحدیں مل گئیں
آج کاکیشیا اور بکشیریا، کشت زاروں میں تبدیل ہونے لگے
آج باشندگانِ سمرقند احیائے الفت کی تدبیر کرنے لگے
آج ان کی مِلوں میں اورورا شعاعوں* کے رنگوں سے ملبوس بننے لگے
ٹنڈرا کی برودت زدہ چوٹیوں پر وہ جلوے سر عام دیکھے گئے
جو پرانے زمانے کے نبیوں کے سینوں میں مستور تھے

* Arora Waves

ماؤزے کی قیادت میں یے نان سے سرخ طوفان اٹھا
جس کے سرکش تھپیڑے ، پرانے پہاڑوں کو جڑ سے گرانے لگے
جس کے بیباک ریلے ، چٹانوں کے دِل چیر جانے لگے
جاں بلب ، چینیوں کے ھجوموں میں یک رنگئ فکر پیدا ھوئی
ان کے شورِ بغاوت سے مینارِ قصرِ جم و کَے لرزنے لگے
ان کے جوشِ تہوّر سے شاھوں کے چہرے اترنے لگے
وہ نئے مورچوں اور فصیلوں سے کہنہ حریفوں کو نخچیر کرنے لگے
وہ نئ زندگی اور نیا دور تعمیر کرنے لگے
وہ پیاماتِ سن یات کوچہ بہ کوچہ سنانے لگے
وہ شہیدوں کا بدلہ چکانے لگے
وہ مروّت کے روشن الاؤ ، بہر سنگِ منزل جلانے لگے
وہ ھر اک خطۂ شور کو آشتی کے گلوں سے معطّر بنانے لگے
وہ جوانانِ چیں کے لبوں کا تبسّم بڑھانے لگے
وہ نگارانِ چیں کو حسیں تر بنانے لگے

مغربی اھرمن ، آج یے نان کے منچلوں کی سنانوں سے مارا گیا
چیانگ بھی اس کشاکش میں اورنگِ جاگیرداری سے نیچے اتارا گیا

آج بنکاک و رنگون کے سر فروشوں نے ھیجان برپا کیا
وہ صداقت کی آواز بن کر ابھرنے لگے
وہ سروں سے کفن باندھ کر سُوئے جنگاہ جانے لگے
وہ ثباتِ خودی کے لئے ، قہرمانوں سے پنجہ لڑانے لگے
کج کلاھوں کو نیچا دکھانے لگے

آج جاوا کے پامرد ، عہدِ غلامی سے پیچھا چھڑانے لگے
وہ بھر قریہ و شہر ، جمہوریت کے پھریرے اڑانے لگے
وہ پئے امن و انصاف ، سر دھڑ کی بازی لگانے لگے
وہ ہر اک ذرۂ بے بضاعت کے دل میں ستاروں کی شمعیں جلانے لگے

وہ سمندِ زمانہ کا دیرینہ راھوں سے رُخ موڑ دینے لگے
وہ ببولوں سے بھرپور جولانگھوں کی حدیں توڑ دینے لگے
ان کے پاؤں کی آواز رفتارِ امروز و فردا کی آواز ھے
ان کے سینوں میں پوشیدہ فطرت کا ھر راز ھے
ان کے چہروں پہ جہدِ مسلسل کی تنویر ھے
ان کے ماتھوں پہ رمزِ مساوات تحریر ھے
وہ رفیقوں کی مانند ، مہر و محبت کی دھومیں مچاتے چلے
وہ بھمراھیٔ کہتر و کم نوا ، جشنِ احیائے الفت مناتے چلے

وہ تلنگانہ صدیوں سے جس کی زمین ، شاخِ گل کی جگہ موت اگلتی رھی
جس کے آغوش میں زندہ لاشوں کے انبار کرگس کی خوراک بنتے رھے
جس کے پھیلے خلاؤں میں آہ و بکا کا دھواں پیچ کھاتا رھا
وہ تلنگانہ — اب مثل سنگاب* ابلنے لگا
اس پہ بکھری ھوئی سرد لاشوں میں خونِ حیاتِ نَوی رقص کرنے لگا
وہ تلنگانہ اب عظمتِ سرمدی کا علمدار ھے
وہ تلنگانہ اب خوابِ دوشیں سے بیدار ھے

---

* لاوا

آج ارضِ تلنگانہ کے گوشے گوشے میں کمیون بننے لگے
آج خاکسترِ زندگی سے وھاں ، زندگی کے ھیولے ابھرنے لگے
آج بُجھتے ھوئے آنسوؤں سے وھاں آبِ مہرِ جہاں تاب پیدا ھوئی
آج سوکھی ھوئی کھیتیوں سے وھاں نرم سبزے کی سنجاب پیدا ھوئی
آج مردِ تلنگانہ نیرنگ فتحِ محبت دکھانے لگا
آج مردِ تلنگانہ تجدیدِ مشرق کا مژدہ سنانے لگا
آج مردِ تلنگانہ ، بے نان و جاوا سے بیدر کے رشتے ملانے لگا

ایشیاء ! ـــ کلفتِ شب کی پروا نہ کر
تیرگی رفتہ رفتہ تیرے دشت و کہسار سے اڑ چلی
تیرے بیٹے شبستاں کی آسودگی سے گریزاں ھوئے
وہ تلاشِ سحر میں مصائب کی صبر آزما گھاٹیوں سے گزرنے لگے
وہ ابھی حُسنِ تدبیر کے پر لگا کر ، افق کی تہوں تک پہنچ جائیں گے
وہ ابھی تجھ کو رنگیں شعاعوں کا ملبوس پہنائیں گے

ایشیاء ـــ مردِ نَو کی ولادت پہ مسرور ھو
یہ وھی ھے ، جسے مظہرِ نورِ فطرت کہیں
یہ وھی ھے ، جسے پاسدارِ رموزِ حقیقت کہیں
یہ وھی ھے ، جسے فاتحِ عہدِ ظلمت کہیں
یہ وھی ھے ، جسے وارثِ عظمتِ آدمیّت کہیں

ایشیاء ـــ اپنی تخلیق تازہ پہ مغرور ھو
ایشیاء ـــ مردِ نَو کی ولادت پہ مسرور ھو

مختار صدیقی

کا تخیل

اس منزلِ شب کا مسافر ہے جس کی تاریکیوں میں ایلورا اجنتا کی سنگین مگر منقّش رومانی خواب پرورش پاتی ہیں ۔ اس کا تصوّر اس جلوہ گاہِ سحر کا خلوتی ہی جہاں «جمالِ ہم نشیں» عشوہ و ناز کی ہزاروں پیکر تراشتا ہی —

منزلِ شب

اردو شاعری کی عظیم روایتوں میں ایک قابلِ فخر اضافہ ہی -

مختار صدیقی

کی تفکر و تجسّس کی فن کارانہ تخلیق

منزلِ شب

قیمت تین روپے آٹھ آنے

نیا ادارہ - لاہور

سویرا آرٹ پریس - لاہور